مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس ۲۵ پونڈ یا چالیس ۴۰ ڈالر

بحری ڈاک نو ۹ پونڈ یا چودہ ۱۴ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۲۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۰۳ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

ملیشیا کے سابق وزیر اعظم ماتر محمد کی اس تقریر کا اخباروں اور رسالوں میں بڑا چرچا ہے جو مسلم ممالک کی تنظیم کے دسویں اجلاس میں مسلم حکومتوں کے سربراہوں کے سامنے کی گئی تھی، یہ تقریر مسلم حلقوں میں ہی نہیں پوری دنیا میں موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور ماتر محمد کی صاف گوئی اور بے باکی سے امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، اس تقریر میں مسلمانوں کو یہ درس و پیام دیا گیا ہے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے　　نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

ماتر محمد کے خیال میں مسلمانوں کے اختلاف اور دانش وری کے میدان میں ان کی پستی سے اسلامی تہذیب بکھر گئی، سقوط غرناطہ کے بعد عثمانی جنگ جوؤں نے مسلم تہذیب کا تحفظ کیا لیکن وہ بھی نہ مسلمانوں میں زندگی کی روح پھونک سکے اور نہ ان میں دانش وری کا احیا کر سکے اور بالآخر اس آخری اور سب سے بڑی مسلم سلطنت کا بھی خاتمہ ہو کر رہا جس کا سبب یورپ کے صنعتی انقلاب سے مسلمانوں کا صرف نظر کر کے اپنے فروعی اختلافات میں الجھے رہنا تھا، اس کا انجام یہ ہوا کہ مسلم ممالک نوآبادیاتی طاقتوں اور سامراجیوں کے غلام بن گئے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کو آزادی تو ملی مگر ایک بھی ایسا مسلم ملک نہیں بچا جس پر یورپی استعمار اور غلبہ نہ ہو اور جو یورپی طاقتوں کی گرفت سے آزاد اور ان کی مرضی و منشا کا پابند نہ ہو۔

ماتر محمد نے خود احتسابی کی جو دعوت دی ہے وہ مسلم حکمرانوں کی طرح ان علمائے کرام و زعمائے ملت کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے، جن کی تنگ نظری اور تعصب اپنے حلقے میں تو درکنار قوم کے مشترکہ پلیٹ فارم پر بھی دوسرے حلقے کے آدمی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی اور سب پر اپنی ہی مرضی اور مذہبی تعبیر کو تھوپ دینا چاہتی ہے، فرماتے ہیں "چودہ سو برسوں میں علما نے اسلام اور نبی اکرم ﷺ کے دین کی اتنی مختلف شرحیں بیان کی ہیں کہ ایک کی جگہ سیکڑوں دین ہو گئے ہیں، ایک امت کے بجائے مسلمان سیکڑوں مذہبوں اور مسلکوں میں منقسم ہو چکے ہیں، ہر ایک اسلامی وحدت پر اصرار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے درپے ہے، دشمنوں کو اس سے بحث نہیں کہ کون سچا مسلمان ہے اور کون نہیں، ان

کے نزدیک سب مسلمان اور اس رسول کے پیرو ہیں جس کو وہ نعوذ باللہ سب سے بڑا دہشت پسند سمجھتے ہیں، اس لیے سارے مسلمان ان کے ازلی دشمن ہیں، وہ ان پر حملے کرتے ہیں، ان کے ملکوں پر یلغار کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، ان کی حکومتیں گرا دیتے ہیں خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ، مسلمان ایک دوسرے سے جنگ کر کے اپنے کو کمزور کرتے اور دشمنوں کی مدد کرتے ہیں، کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ مسلمان ان کے ساتھی بن کر اپنے بھائیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کی حکومتیں ختم کر کے اپنے کو کمزور بناتے رہتے ہیں اور مسلمان حکمراں وہ اخوت کا درس بھول جاتے ہیں جو اسلام نے ان کو دیا تھا۔

علما شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس دیتے ہیں اور دنیا کی عزت و غلبہ، عظمت و سربلندی اور نعمت و آسایش کے لیے سعی و کوشش کو بیکار سمجھتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ ذلت و مسکنت، نکبت و فلاکت اور دشمنوں کے ظلم و ستم اور اپنی رسوائی و بربادی کو برداشت کرتے رہنا چاہیے، دنیا کا عیش و آرام خدا کے نافرمانوں کے لیے ہے، بندۂ مومن کو یہاں تکلیف اٹھانی ہی ہے، اس کے لیے آخرت کی کامرانیاں اور جنت و حور و قصور ہیں، ملیشیا کے سابق حکمراں کہتے ہیں کہ "ہم میں سے کچھ لوگ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ سب کچھ کے باوجود ہماری زندگی ہمارے دشمنوں سے اچھی ہے، کچھ یہ سمجھاتے ہیں کہ غربت و مفلسی اسلامی اقدار ہیں، مصائب و آلام اور ظلم و ستم انگیز کرنا اسلامی فعل ہے، ہمیں تو موت کے بعد جنت کی نعمتیں ملیں گی، دنیا اور اس کی آسایشیں ہمارے لیے کہاں؟ ہماری مظلومی اور بے بسی اور اپنے بھائی بہنوں کی حفاظت میں ناکامی اللہ کی مشیت ہے، جنت کی نعمتوں کے لیے تکلیفیں اٹھانا ضروری ہے، ہمیں اپنے مقدر کے سامنے سرفگندہ رہنا چاہیے، ہم اللہ کی منشا کے بغیر کیا کر سکتے ہیں، لیکن کیا یہ اللہ کی مرضی ہے کہ ہم کچھ نہ کریں، وہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہ کرے، اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی مسلمان دبے کچلے تھے لیکن ان کے پختہ عزم و ارادے کی بہ دولت دشمنوں کو شکست دینے میں اللہ نے ان کی مدد کی، آج ہمارے پاس وسایل پہلے سے زیادہ ہیں لیکن ہم نے اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کی"۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی　　عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانا

علما کی غلط تشریح و تعبیر نے جدید علوم اور دفاع کے جدید وسایل اختیار کرنے سے انہیں باز رکھا ہے، ماتر محمد فرماتے ہیں "آج ہم ایک ارب ۳۰ کروڑ ہیں، ہمارے پاس سب سے زیادہ تیل کے ذخایر

ہیں، شروع شروع میں اسلام قبول کرنے والوں کی طرح ہم ناخواندہ بھی نہیں، موجودہ معاشیات اور مالیات کے نظام سے بھی واقف ہیں، دنیا کے ۱۸۰ ملکوں میں ۵۷ ملکوں کے ہم حکمراں ہیں، ہمارے ووٹ بین الاقوامی اداروں کو توڑ یا بنا سکتے ہیں، اس کے باوجود ہم ابتدائی دور کے مسلمانوں سے بھی زیادہ کمزور ہیں، اس لیے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے یا اس لیے کہ ہم نے اپنے دین کی غلط تشریح کی ہے اور دین کی صحیح تعلیمات سے روگردانی کی ہے، فرماں رواوں کو اسلام نے امت کی حفاظت پر مامور کیا تھا لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی دفاعی حکمت عملی سے غافل ہیں، اس زمانے کے اسلحے اور گھوڑے مسلمانوں کا دفاع نہیں کرسکتے، آج جدید ترین ہتھیار، راکٹ، بم بار طیارے، بحری بیڑے اور بم درکار ہیں لیکن سائنس اور ریاضی کی تعلیم سے محروم رہ کر وہ یہ ہتھیار نہیں بنا سکتے اور اپنے دشمنوں سے ان کو خرید رہے ہیں، یہ دین کی سطحی اور ناقص تشریح، سنت کی روح اور قرآن کریم کی گہرائی اور گیرائی پر زور نہ دینے اور پہلی صدی ہجری میں موجود صور و اشکال پر زور دینے کا نتیجہ ہے، لوگ کلام الٰہی کے معنی و مطلب کے بجائے اس کی ظاہری ہیئت و ماہیت پر زور اور ارشاد رسالت کی لفظی ترجمانی تک محدود رہتے ہیں، غرض اس آئینۂ گفتار میں ارباب دول، مشائخ و علما اور زعما سب ہی اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

معارف کے اشاریے کی ترتیب کی اطلاع بہت پہلے دی جاچکی ہے، اس لیے اس کی اشاعت کا انتظار نہایت بے چینی سے ہورہا ہے لیکن اس درمیان اشاریے اور اشاریہ نگار ڈاکٹر جمشید احمد ندوی کسی نہ کسی افتاد سے دوچار ہوتے رہے تاہم اب اس کی کمپوزنگ آخری مرحلے میں ہے، یہ اشاریہ تین طریقوں مضامین، موضوعات اور مضمون نگاروں کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے جو ۱۹۱۶ء سے ۲۰۰۰ء تک کا ہے اور ایک ہزار سے زاید صفحوں پر مشتمل ہوگا، حال ہی میں یہ خوش خبری بھی ملی ہے کہ روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے ایک اسکالر جناب محمد اطہر مسعود خاں نے محکمہ اطلاعات اتر پردیش کے اردو ماہنامہ نیا دور کے اشاریے کی ترتیب کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے، یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو مارچ ۲۰۰۳ء میں یونیورسٹی میں جمع کیا جاچکا ہے اور ۱۹۵۵ء سے ۲۰۰۱ء تک کے ۵۰۰ شماروں کا اشاریہ ہے اور موضوع اور مضمون نگار کے اعتبار سے مرتب ہوا ہے، دونوں اشاریہ نگار لایق اور ذی علم ہیں، اشاریوں کے نمونوں سے مرتبین کی محنت اور سلیقے کا پتا چلتا ہے، جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ جلد ان کی

مقالات

رسالت

از ضیاء الدین اصلاحی

کئی ماہ پہلے ہم نے ان صفحات میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کی تصنیف القائد الی عیون العقائد کے مقدمہ کے مباحث پیش کیے تھے، بعض اہل علم نے اس کو پسند کیا تھا اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کی فرمائش کی تھی مگر افسوس کہ بعض موانع کی بنا پر یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔

مقدمہ میں اسلامی عقاید کے بعض اصولی اور بنیادی مسایل بیان کیے گئے تھے جن میں عقاید کی حقیقت، اہمیت اور ضرورت وغیرہ کا ذکر تھا، اس کے بعد کتاب کے تین ابواب میں توحید، رسالت اور معاد پر مولانا نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں قرآن مجید کی روشنی میں اہم اور اصولی مطالب تحریر کیے ہیں، سردست ہم دوسرے باب کے مندرجات پیش کرتے ہیں جو عقیدہ رسالت سے متعلق امور و مسایل پر مشتمل ہیں لیکن مولانا کے اصل خیالات پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دوسرے رسایل و کتب کی طرح یہ رسالہ بھی نامکمل اور غیر مرتب تھا، دائرہ حمیدیہ کے سابق ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کے منتشر اجزا کو یکجا اور مرتب کیا، اس کے باوجود جیسا کہ اہل علم و نظر قارئین کو بھی اندازہ ہوگا کہ اب بھی اس میں خاطر خواہ ربط و ترتیب اور باقاعدہ تصنیف کی شان نہیں پیدا ہوسکی ہے، اس لیے جو بحثیں آگے آئیں گی، انہیں بہت غور و خوض سے پڑھنا چاہیے کیوں کہ یہ دقیق حقایق و معارف ہیں جو عام کتب کلامیہ کے انداز سے مختلف اور مولانا کے قرآن مجید میں امعان نظر کا نتیجہ ہیں

مولانا نے اس بحث کا آغاز مندرجہ ذیل آیات کریمہ سے کیا ہے:۔

إنا ارسلناك بالحق بشيرا ونذيرا وان من امة الا خلا فيها نذير (۲۴:۳۵)

اور ہم نے تم کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو۔

دوسری آیت یہ نقل کی ہے:۔

وما ارسلناك الا رحمة للعالمين (۱۰۷:۲۱)

اور ہم نے تم کو تو بس اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

۱- انبیا کی ضرورت: اس باب کی پہلی فصل میں انبیا کی ضرورت بیان کی گئی ہے، مولانا فرماتے ہیں، نبی کی ضرورت اس بنا پر نہیں ہوتی کہ انسان کی عقل رب کی معرفت اور اس کے نظام عدل کو جاننے سے قاصر اور ناکافی ہے بلکہ یہ ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ انسان جس چیز کو جانتا ہے نبی آکر اسے یاد دلا دیتا ہے، اس کی وجہ سے انسان کے لیے دو شاہد ہو جاتے ہیں ایک تو داخلی و باطنی شاہد جو خود اس کی عقل ہے اور دوسرا وحی و تنزیل ہے جس کی حیثیت خارجی و بیرونی شاہد کی ہے۔ اس طرح اس کی ہدایت اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت کے اتمام کے دو چند اسباب ہو گئے جیسا کہ اس نے خود سورۂ انعام میں فرمایا:۔

يا معشر الجن والانس الم ياتكم رسل منكم يقصون عليكم اياتي و ينذرونكم لقاء يومكم هذا قالوا شهدنا على انفسنا وغرتهم الحيوة الدنيا وشهدوا على انفسهم انهم كانوا كافرين ذلك ان لم يكن ربك مهلك القرى بظلم (اى بسيئاتهم) و اهلها غافلون (۱۳۱،۱۳۰:۶)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے پاس تمہیں میری آیتیں سنانے اور تمہارے اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے تم ہی میں سے رسول نہیں آئے، وہ بولیں گے ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر رہے، یہ اس وجہ سے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم (یعنی گناہوں) کی پاداش میں اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں۔

نیز فرمایا:۔

رسلا مبشرين و منذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل وكان الله عزيزا حكيما (۱۶۵:۴)

اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔

ہماری فطرت میں ایسی بصیرت ودیعت کی گئی ہے جو حق و باطل میں فرق و امتیاز کرتی ہے، اس کے باوجود رسولوں کا مبعوث کیا جانا اللہ تعالیٰ کا ایک اور فضل و احسان ہے، عاقل و دانا شخص کو شہوات کی ظلمتوں کی کثافتوں اور عقل کی گمراہیوں کا علم ہو جاتا ہے اور نفوس کے خیر و صلاح کے بارے میں حکما کی رایوں کا اختلاف بھی اسے نظر آنے لگتا ہے اور وہ اللہ کا اس کے اس فضل و احسان پر شکر گزار ہوتا ہے اور نجات کے اس ذریعہ سے مطمئن ہو کر اس سے چمٹ جاتا اور اس کا تابع ہو جاتا ہے، اس طرح اس کے لیے راہ نجات ہموار ہوتی جاتی ہے اور وہ اس پر امن و اطمینان سے چلنے لگتا ہے۔

جس طرح آدمی اس دنیا میں سلطنت کی موجودگی اور عدل کے احکام و قوانین کے نفاذ کو اس بنا پر غنیمت سمجھتا ہے کہ ان سے اس کے مصالح کی تکمیل اور تمدنی ترقی ہوتی ہے، نبوت کی ضرورت کا منکر آدمی اس شخص سے بھی برا اور بدتر ہے جو سلطنت کی ضرورت کا انکار کر کے نظام معاشرت و تمدن کو درہم برہم اور فطرت انسانی کے مقتضی کے خلاف آمادہ پیکار رہتا ہے۔

خیر و صلاح پسند لوگوں کو انبیا و ملوک دونوں ہی کی احتیاج اور ضرورت نہ ہوتی تو ہم آغاز تاریخ ہی سے سلطنت و نبوت کو ساتھ ساتھ نہ دیکھتے، اس کی وجہ سے ہمارا اس پر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ انسانی فطرت میں دونوں کا اقتضا و داعیہ پایا جاتا ہے کیوں کہ انسان کو عدل محبوب و مرغوب ہے اور وہ دار آخرت، اعمال کی جزا اور عدل کرنے والے اللہ پر یقین رکھتا ہے، ائمہ ضلالت و طاغوت کا وجود انسان کی صلاح پسند فطرت کے معدوم ہو جانے کا ثبوت نہیں ہے، جس طرح کہ سلطنت کے باغیوں، سرکشوں اور زمین میں فساد برپا کرنے اور رعایا پر ظلم و جبر کرنے والوں کی موجودگی انسان کے اندر فطرت عدل کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، یہ چیزیں بیماریوں

کے مانند ہیں اور ہم جس فطرت کا ذکر کر رہے ہیں اس کا تقاضا و داعیہ صحت مند اور تندرست انسان کرتا ہے، یہ حقیقت ہم اس موقع پر بیان کر چکے ہیں جہاں ہم نے کہا ہے کہ توحید تو انسان کی فطرت کا اقتضا ہے۔

نبوت کی ضرورت کے سلسلے میں دو باطل رائیں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی غلطی کا منشا و سبب بیان کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:۔

ایک گروہ نے فطرت کو اس کی اصل جگہ اور درجے کے بجائے بہت بلند و بالا درجہ و مرتبہ پر رکھا ہے، یہ لوگ اس کے قایل ہیں کہ انبیا کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہے اور دوسرے گروہ نے اس کو اصل درجے سے بھی نیچے گرا دیا ہے، اس کے خیال میں علم نجات کا کوئی راستہ نہیں کیوں کہ نفوس انسانی کے اندر فطری اور طبعی طور پر گندگی، رجس اور شر پایا جاتا ہے، اس لیے کسی نجات دہندہ کا ہونا لابد ہے، مولانا کے نزدیک یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ فطرت انسانی کے دو کناروں میں سے کسی ایک ہی کنارے پر ان دونوں گروہوں کی نگاہیں پڑیں اور ہر ایک سے دوسرا کنارہ اور پہلو اوجھل رہ گیا...... لیکن ہم کو اللہ تعالیٰ کا یہ قانون معلوم ہے کہ مخلوق کے امور و معاملات محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ اللہ اپنے بندوں پر مزید احسانات کرتا ہے اور انہیں ایک قوت دینے کے ساتھ دوسری قوت سے بھی سرفراز کرتا ہے، مثلاً اگر وہ چاہے تو سب کو ایک ہی طرح کا رزق عطا کرتا یا ان کے لیے حصول رزق کا ایک ہی وسیلہ اور سامان مہیا کرتا بلکہ اگر وہ لوگوں کے ایک ہی آنکھ اور کان بناتا تو یہ بھی ان کے لیے کافی ہو جاتا مگر اس کا خزانہ قدرت نہایت وسیع ہے، وہ اپنے بندوں کو بے شمار نعمتیں عطا کرتا اور بہت سے معاملات میں اس نے اپنی اکثر مخلوقات پر انسان کو فضیلت بخشی ہے، اسی طرح اس نے ان کی ہدایت کے متعدد اسباب و وسایل عطا کئے ہیں تا کہ ان پر اپنی نعمت و حجت دونوں کی تکمیل کر دے، پس اگر وہ محض ان کی فطرت ہی کی وجہ سے ہدایت کے معاملہ میں ان کا مواخذہ کرتا تو یہ بھی اس کا عدل ہوتا کیوں کہ آسمان و زمین اس کے دلایل و آیات سے مملو ہیں مگر اس نے رسولوں کو بھیج کر اور کتب سماوی نازل کر کے بھی ان پر احسان کیا ہے، شرایع الٰہی کو نعمت کہے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

انسان اپنی اسی فطرت کی بنا پر احکام الٰہی کا مامور اور پابند بنایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:۔

وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (۲:۱۸۶)

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو چاہیے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تا کہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔

پس حیوانات ہی کی طرح انسان کو بھی اوامر فطرت کا مامور بنایا گیا ہے لیکن وہ ظلوم (ظلم کرنے والا) وجہول (جذبات سے مغلوب ہو جانے والا) ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس امر فطری کا معروف نام امر رکھا ہے جیسا کہ فرمایا:۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷:۵۴)

آگاہ کہ خلق و امر اسی کے لیے خاص ہے۔

نیز فرمایا:۔

فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (۲:۲۲۲)

تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔

اسی امر فطری کی بنا پر اللہ تعالیٰ انبیا کی اطاعت کے بارے میں لوگوں سے مواخذہ کرے گا اور نبیوں کی اطاعت کو اس نے اپنی اطاعت کا نام دیا ہے اور اپنے دین کا نام فطرت اور صراط مستقیم رکھا ہے اور اپنے نبی کو مذکر (یاد دلانے والا) کہا ہے، دراصل یہی فطرت ہر قانون کی اساس ہے، اگر یہ نہ ہو تو نہ نیکی ہوگی اور نہ برائی اور کارخانہ عالم کی تخلیق عبث اور بے مقصد ہو جائے گی، نبی اسی امر فطری کی آواز ہوتا ہے۔

۲- فصل دوم میں نبی کی بعثت کے زمانے کی خصوصیات کا ذکر ہے، اس سلسلے میں دو امور کا تذکرہ ہے، اول یہ کہ نبی کی بعثت حساب و دینونت اور قیامت کی دلیل و علامت ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

۱- یہ بات جان لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کے اندر نبی کے مبعوث کیے جانے کو اس کے حساب اور دینونت کا دن بنایا ہے، اس کی تصریح اس نے قرآن مجید اور صحایف اولی

میں بھی کی ہے، بعثت کے بعد باطل پر حق کا غلبہ متوقع ہوتا ہے کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختار بنایا ہے تو اس کے اختیار کے ظہور کے لیے ایک لمبی مدت بھی مقرر کی ہے تاکہ اس کی فطرت میں جو دبی اور مخفی چیزیں ہیں ان کو باہر کردے، چنانچہ جب کسی قوم کی سرکشی اور باطل کی طرف اس کا میلان حد انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی ابتلا کی مدت مکمل ہوجاتی ہے اور عدل و جزا کے ظہور کا دن آجاتا ہے، جس کے بعد وہ قوم فنا ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کردی جاتی ہے۔

کبھی کبھی خود ہلاک ہونے والوں کی نسل ہی سے نئی امت کو اللہ تعالیٰ پیدا کردیتا ہے، اس طرح کا مشاہدہ ہم عالم حیوانات و نباتات میں بھی کرتے ہیں، ان سب کی ایک اجل ہوتی ہے، اس کے ختم ہوجانے پر یہ بھی ختم ہوجاتے ہیں اور ان کی نسل ان کی جگہ لیتی ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنی رحمت کی بنا پر ان لوگوں سے مواخذہ نہیں کرتا جو (ہدایت الٰہی سے کسی وجہ سے) غافل اور بے خبر رہ جاتے ہیں کیوں کہ ممکن ہے ان میں سے بعض لوگوں میں عجز، تضرع اور گریہ وزاری پیدا ہوجائے تو اللہ ان کو برکت دے کر ختم ہوجانے والوں کا جانشین بنادے اور اس امہال کے بعد بھی جو لوگ فائدہ نہ اٹھائیں تو ان پر اپنی حجت تمام کردے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بھیجتا ہے تو یہ اس بات کا نشان ہوتا ہے کہ اب اس کی قوم کے محاسبہ کا وقت آگیا ہے اور اختیار و ابتلا کے ظہور کے بعد عدل کے ظہور کی تجلی نمایاں ہوتی ہے، یہ بات ہم اس مقام پر لکھ چکے ہیں جہاں ہم نے یہ بحث کی ہے کہ نبی عدل، دینونت اور جزا کا مظہر ہوتا ہے۔

نبی کی بعثت بارش اور بہار کے موسم جیسی ہے، جس طرح اس زمانے میں کوئی بیج بھی زمین پر گرتا ہے تو وہ تیزی سے نشوونما پاتا اور بارآور ہوتا ہے، اسی طرح جب نبی آتا ہے تو حق اپنی پوری آب و تاب سے آجاتا اور باطل غایب ہوجاتا ہے کیوں کہ محو و معدوم ہونا باطل کا قطعی و حتمی مقدر اور اس کی فطرت کا لازمی اقتضا ہے۔

۲- اس فصل کے دوسرے عنوان ''نبی سے اللہ کا مواخذہ'' میں مولانا فرماتے ہیں:

چوں کہ نبی کا ظہور عدل الٰہی اور اس کی بعثت زمانہ حساب ہے، اس لیے اس کے اندر کمال عدل کا پایا جانا ضروری ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ دوسروں سے زیادہ سختی و شدت کے ساتھ اس کا مواخذہ

کرتا ہے، چنانچہ بیٹے پر شفقت کے نتیجے میں اس نے حضرت نوحؑ پر عتاب کیا اور حضرت داؤدؑ کو ان کی تمنا پر عتاب کیا اور حضرت محمدؐ کو ان کے کمال رافت کی بنا پر عتاب ہوا، حضرت سلیمانؑ کا محاسبہ سامان جہاد سے ان کے غیر معمولی شغف پر ہوا، اسی طرح حضرت یونسؑ سے بھی اللہ نے محاسبہ کیا، ایسا اس بنا پر کیا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا ہی میں پاک و صاف کردے اور انہیں کسی برائی میں پڑنے سے بچالے، انبیاء کی عصمت کی بحث میں اس مسئلے پر شرح و بسط سے بحث ہوگی، یہاں ہم عدل کے ذکر پر اکتفا کریں گے، یہ بات اس کے موقع پر ہم بیان کرچکے ہیں کہ عدل انبیا کی فطرت ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے درجے و مرتبے کی قربت کی بنا پر اس سے سب سے زیادہ ڈرتے اور اس سے گریہ وزاری کرنے والے ہوتے ہیں، مخالف عدل چیزوں کا شدید احساس رکھنے کی بنا پر وہ بہت زیادہ توبہ اور اللہ سے رجوع کرنے والے ہوتے ہیں، ان کی یہ حالت ان کے رب کی خاص توجہ و عنایت کو مبذول کرنے والی ہوتی ہے، چنانچہ سنت الٰہی ان کی استعداد اور پھر زمانہ بعثت کے قاعدہ عدل کے مطابق ان سے معاملہ کرتی ہے، وہ اپنی امت کے کسی عام فرد کی طرح نہیں ہوتے، جس طرح کہ وہ امت جس میں نبی کو مبعوث کیا گیا ہے عام لوگوں جیسی نہیں ہوتی کیوں کہ اس امت کا محاسبہ دنیا ہی میں ہوجاتا ہے اور دوسرے لوگوں کا معاملہ روز قیامت کے حوالہ کردیا جاتا ہے، مسلمانوں اور یہود کے حالات ہماری بات کے شاہد ہیں اور قرآن مجید میں بھی اس کی صراحت ہے، اس کا مفصل بیان ہماری کتاب ملکوت اللہ میں ملے گا۔

۳- ''تعریف النبی و فاتحۃ امرہ'' کتاب کی تیسری فصل کا عنوان ہے، اس میں لکھتے ہیں:

۱- جو لوگ انبیا کے ان حالات پر غور و تامل کریں گے جو قرآن مجید اور صحف الٰہی میں مذکور ہیں، ان پر یہ حقیقت ضرور منکشف ہوجائے گی کہ انبیا بھی بشر ہوتے ہیں لیکن ان کی بشریت کامل ہوتی ہے اور مبدء فیاض سے ان پر ان کی استعداد کے مطابق بشری وحی جلی کا فیضان ہوتا ہے، انسانی فطرت کے احوال میں غور و استقصا سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے اور کتاب الٰہی نے بھی ہم کو اس سے آگاہ کیا ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے روح قدسی پھونک کر اسے معزز و مکرم بنایا ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو رب رحیم، عادل و دیان کا الہام کیا گیا ہے، جس کی

تعبیر خدانے اپنے اس قول میں کی ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۱:۱-۳)

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا وسزا کے دن کا مالک۔

لیکن اس الہام پر کثافت زدہ نفوس میں خواہشات کا غلبہ ہوجاتا ہے مگر جس شخص کی فطرت کامل ہوتی ہے اور اس کی طبیعت میں زود فہمی اور ذکاوت ہوتی ہے، اس کو اس پر ایسا پختہ یقین ہوجاتا ہے جس میں کسی شک وشبہہ کا شائبہ نہیں ہوتا، اسی بنا پر ہر نبی کو جزا، عدل اور قسط پر یقین ہوتا ہے اور وہ ظلم وکفرانِ نعمت سے باز رہتا ہے اور اپنے دل میں رحم وشفقت کا ہیجان اور زندہ اور احسان کرنے والے اللہ کی عبودیت اور اس پر توکل کا جوش پاتا ہے، غور کرو کہ حضرت یوسفؑ کو کس طرح اس کی وحی کردی گئی تھی کہ ان کے بھائیوں کا ظلم ان پر آشکارا ہوجائے گا کیوں کہ حضرت یوسفؑ کا عدل پر ایمان تھا اور وہ اپنے بھائیوں پر اپنے فضل وشرف سے پہلے ہی مطلع ہوگئے تھے اور انہیں شروع ہی میں یہ نظر آنے لگا تھا کہ ان کے بھائی ان کو سجدہ کریں گے، قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۲:۱۵)

پس جب وہ (یوسف کے بھائی) اس (یوسف) کو لے گئے اور طے کرلیا کہ اس کو کنوئیں کی تہہ میں پھینک دیں اور ہم نے اس کو وحی بھی کردی کہ تم ان کو ان کی اس کارستانی سے آگاہ کروگے جب کہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ کو ہم دیکھتے ہیں کہ مظلوم کی مدد وحمایت کے لیے ان کے اندر جوش وہیجان بھڑک اٹھتا ہے اور ابھی وہ بچے ہی تھے کہ قبطی کو گھونسا مار دیا۔

انبیا کے یہی حالات (ابتداءً) ہوتے ہیں پس جب انہیں رب رحیم کی معرفت کا یقین ہوجاتا ہے اور وہ جان لیتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں سے سرفراز ہیں تو اس کی حمد وشکر بجالاتے ہیں اور اسی پر توکل کرتے ہیں، ان کو یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ جزا برحق ہے اس لیے وہ اللہ ہی کی طرف متوجہ اور اسی کی ذات پر مطمئن رہتے اور تمام معاملات میں اسی سے مدد کے خواستگار

ہوتے ہیں، جس کی تعبیر اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ملتی ہے:۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۱:۴)

ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی سب سے محبوب اور پسندیدہ چیز عدل ہے، اسی پر وہ سارے عالم کو چلا رہا ہے، نبی اس موڑ پر پہنچ کر اپنی سب سے اول واعلا جس احتیاج کا سوال کرتا ہے وہ عدل کے مناہج پر چلنے کی مانگ ہے، یہی تمام مخلوقات کی صراط (راستہ) اور اطاعت وعبودیت کی صراط ہے تاکہ وہ اللہ کے اطاعت گزاروں کی صف میں شامل اور اس سے دور کردینے والی کجی اور گمراہی کے گڑھوں سے نکل آئے جس کی وحی اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کی گئی ہے:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (ای سبیل العدل والحق الموصل الی الرب تعالی کما قال "اِنَّ رَبَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ") صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (ای المقسطین الذین ھداھم اللہ الی صراطہ) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (لما انھم نبذوا الحق بعد العلم وآثروا الحیوة الدنیا) وَلَا الضَّآلِّيْنَ (لما ران علی قلوبھم سوء اعمالھم فحرموا العلم ایضاً فعموا وصموا کالبھائم) (۱:۵-۷)

ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش (یعنی عدل وحق کے راستے کی جو رب تعالیٰ کی طرف پہنچانے اور لے جانے والا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا کہ "بے شک تیرا رب صراط مستقیم پر ہے") ان لوگوں کے رستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا (یعنی ان حق وانصاف پسندوں کے رستے کی جن کو اس نے اپنے رستے کی ہدایت وتوفیق دی ہے) جن پر نہ غضب ہوا ہے (کیوں کہ مغضوب نے جاننے کے بعد بھی حق کو چھوڑ دیا اور دنیوی زندگی کو ترجیح دیا) اور نہ جو گمراہ ہوئے ہیں (کیوں کہ گمراہوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال چھاگئے ہیں اور وہ علم سے بھی محروم کردیے گئے ہیں، پس وہ چوپایوں کی طرح اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں)۔

انسانی فطرت کے کمال کے لحاظ سے یہی وہ کامل بشری وحی ہے جس کو ایک پاک

صاف شخص اپنی اس فطرت کے پیچھے سے سنتا ہے جو روح قدسی کی فرودگاہ ہے جیسا کہ آنے والی فصل میں ہم اسے بیان کریں گے۔

۲- نبی چوں کہ فطری الہام سے پر اور مملو ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اسے مزید وحی سے بھی سرفراز کرتا ہے تاکہ وہ ظالموں کو بھی آگاہ اور ہوشیار کردے اور نبی کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا امام اور رہنما بنایا ہے جس کی اولین تعلیم توحید و جزا کی ہوتی ہے اور اس کی اصل و بنیاد شکر ہے جس کا ضد کفر ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب حجج القرآن میں اسے بیان کرچکے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ (۴۰-۱۵)

اللہ روح کو جو اس کے امر میں سے ہے ڈالتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے تاکہ وہ (لوگوں کو) روز ملاقات سے آگاہ کردے۔

۳- نبی کا اصل کام رسالت ہے، اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ قرآن مجید میں یہ اس کے بدل کے طور پر آتا ہے، سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ آیَاتِ اللّٰهِ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۶۵:۱۰-۱۱)

اللہ نے تمہاری طرف ایک یاد دہانی اتار دی ہے، ایک رسول جو تمہیں اللہ کی واضح آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے۔

اور یہ بدل اسی طرح کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وَلَقَدْ نَجَّیْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِیًا مِّنَ الْمُسْرِفِیْنَ (۴۴:۳۰-۳۱)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی، یعنی فرعون سے، بے شک وہ بڑا ہی سرکش، حدود سے نکل جانے والا تھا۔

یہاں فرعون عذاب کے بدل کے طور پر آیا ہے، گویا فرعون ہی نفس عذاب تھا۔

اسی لیے جب حضرت عائشہؓ سے آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق دریافت کیا گیا

تو انہوں نے فرمایا:۔

کان خلقه القرآن[1] آپ کا خلق قرآن تھا۔

یعنی قرآن آپ کے اندرون اور راز کا آئینہ ہے، جو کچھ تمہیں قرآن میں نظر آتا ہے، وہ آپ کے اخلاق کے مطابق ہے، جس طرح کہ ہر صناع اور کاریگر کا عمل اس کے نفس کی تصویر ہوتا ہے، قرآن اللہ کی جانب سے وحی ہے لیکن اسی کے مطابق اللہ کے نبی کے اخلاق بھی بنائے گئے ہیں کیوں کہ اس کا کلام اسی پر نازل ہوتا ہے جس کے اندر اس کی استعداد و قابلیت ہوتی ہے، اس کی حیثیت پودے کی کلی کی طرح ہے، پس وحی نبی کے حال سے اتنا زیادہ مشابہ ہوتی ہے کہ تم کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ نبی ہی کا کلام ہے۔

نبی بھی عام لوگوں کی طرح نشو و نما پاتا، سیکھتا اور تربیت حاصل کرتا ہے لیکن اس میں پوشیدہ فطرت وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ سب سے فائق و برتر ہوجاتا ہے، اپنے دور ارتقا میں بھی نبی سب سے اچھا اور عمدہ طریقہ اختیار کرتا ہے لیکن عوام فطرت کے معاملے میں عجز و بے بسی کی وجہ سے پے درپے گرتے یا جہالت کی وجہ سے بھٹکتے رہتے ہیں، نبی اوائل عمر میں اپنے ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی عام اشخاص ہی کی طرح ہوتا ہے، پھر وہ درجہ بہ درجہ اور منزل بہ منزل ان سے آگے بڑھ جاتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا و بخشش سے ہر ایک کی مدد اس کی سعی و جہد اور استعداد ہی کے مطابق کرتا ہے اور جب نبی ایک خاص درجہ کو پہنچ جاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے تو اسے نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرلیتا ہے، یہ ایک دوسری بحث ہے کہ اللہ اپنے سابق علم کی بنا پر اس کا انتخاب پہلے ہی سے کرلیتا ہے۔

وحی و نبوت آنے کے بعد بھی نبی کی رفتار نہیں رکتی بلکہ وہ برابر تقرب حاصل کرتا اور

---

[1] صحیح مسلم کتاب صلاۃ المسافرین باب صلاۃ اللیل و من نام عنها او مرض، ج ۱،ص ۲۷۸ میں یہ روایت اس طرح ملتی ہے، حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا ام المومنین مجھے رسول اللہؐ کے اخلاق کے بارے میں بتایئے تو انہوں نے فرمایا:

ألست تقرأ القرآن قلت بلی قالت فان خلق نبیؐ الله کان القرآن۔ — کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے تو میں نے کہا کیوں نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ نبی ﷺ کے اخلاق قرآن ہی تھے۔

زینہ بہ زینہ ترقی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ علم، بصیرت، یقین، تقوی اور توکل کے جس بلند درجے پر اللہ چاہتا ہے اسے پہنچا دیتا ہے، اس کی بخشش کبھی ختم نہیں ہوتی۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ ایک محکم اصل ہے جس کی طرف قرآن مجید اور صحف اولی نے رہبری کی ہے، پھر اسی سے یہ امور بھی واضح ہوتے ہیں:۔

۱- نبی اپنی فطرت، استعداد اور اللہ تعالی کے سابق علم کی بنا پر سارے لوگوں سے ممتاز ہوتا ہے لیکن اس کے ابتدائی حالات ظاہر اًعام لوگوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔

۲- ضرورت پیش آنے اور کسی منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ اس بات کو تفصیلی طور پر نہیں جانتا کہ حق کیا ہے مگر جب کوئی معاملہ پیش آجاتا ہے تو اس کے سامنے باطل سے چھٹ کر حق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

۳- پھر جب اللہ اسے وحی ناطق سے سرفراز کرتا ہے تب بھی بعض اوقات وہ کچھ معاملات میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ وحی کا انتظار کرتا ہے، اس کا یہ سکوت، توقف اور انتظار بھی اس کی صحت رائے اور امور میں اس کی فہم وتمیز ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

آگے مولانا ملکہ نبوت کی تعریف اور اس کی بعض خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

صحیح اندازے اور حدس صائب کی وجہ سے لوگوں کی دیانت اور جودتِ رائے کی پہچان کے بارے میں بادشاہوں کو ایسا ملکہ ہو جاتا ہے اور ان کے اندر ایسی عقل کلی پیدا ہو جاتی ہے جو سلطنت کے مصالح کی ضامن ہوتی ہے، چنانچہ وہ ہر مہم کے لیے بہترین افراد کا انتخاب کر لیتے ہیں پھر وہ روز بہ روز ان کی آزمائش کرتے ہیں اور انہیں درجہ بہ درجہ ترقی دیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان کو ان پر مکمل بھروسہ ہو جاتا ہے تو انہیں اپنا معتمد وزیر بنا لیتے ہیں، اس طرح بادشاہوں کے اندر ایسی طبیعت وخصوصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ لوگوں کے قلوب، سلطنت کے ارکان اور قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو اس طرح کھینچ لیتے ہیں کہ وہ بادشاہ کی مرضی اور خوشنودی کے لیے اپنی جان لڑا دیتے ہیں، جب ان بادشاہوں سے مشورے طلب کیے جاتے ہیں تو وہ اعیان سلطنت کے اقوال وتجربات سن کر اور اپنی ذکاوت وذہانت سے بہترین رائے کو اخذ کر لیتے ہیں، باوجودے کہ ان کو فنون کی جزئیات اور دقیق باتوں سے واقفیت نہیں ہوتی اور نہ وہ

انجینئرنگ، معماری اور جنگی تدبیروں سے باخبر ہوتے ہیں، ان کو اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ رذیل لوگوں سے معاملہ کرنے اور نپٹنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔

جزئیات کے بارے میں نبی کی عقل کلی کا حال بھی یہی ہوتا ہے، وہ اپنے وزرا سے جنگی تدبیروں اور لوگوں سے معاملہ اور برتاؤ کرنے کے طریقوں کے بارے میں مشورے کرتا ہے لیکن جب وہ قوانین کلی کی تاسیس کرتا، شرعی نوامیس کو ہموار کرتا اور اخلاق کے آداب واصول مدون کرتا ہے تو وحی اور اپنی الگ رائے سے کرتا ہے، اسی لیے تم کو قرآن مجید میں کلی احکام نظر آتے ہیں، وہ فضول اور بے مطلب باتوں میں نہیں پڑتا چنانچہ قصوں کی جزئیات اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے تاکہ لوگ غیر ضروری معاملات میں الجھ کر نہ رہ جائیں جیسا کہ اصحابِ کہف اور حضرت یوسفؑ کی سرگزشت میں تمہیں نظر آتا ہے حتی کہ آنحضرت ﷺ کو بھی اس نے مشورے کا حکم اسی لیے دیا ہے کہ نبی کے لیے طب اور انجینئرنگ اور معماری وغیرہ کا جاننا ضروری نہیں ہے اور نہ وہ فنونِ حرب، جنگی تدبیروں، زراعت وتجارت اور اس جیسی دوسری چیزوں کی تفصیلات اور باریکیوں کو جانتا ہے، اس اصل کی تائید میں احادیث اور قرآنی آیات موجود ہیں۔

حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگ تابیرِ نخلہ کرتے تھے، آپؐ نے دریافت کیا یہ کیا کرتے ہو، لوگوں نے کہا ایسا ہی ہم کرتے آئے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگ یہ نہ کرو تو بہتر ہے، چنانچہ لوگوں نے اسے چھوڑ دیا مگر اس کے بعد پھل کم آئے تو انہوں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشئی من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشئی من رأیی فانما انا بشر[1]

میں ایک آدمی ہی تو ہوں جب تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اسے اختیار کرو لیکن جب تمہیں اپنی رائے سے کسی چیز کا حکم دوں تو میں ایک بشر ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب آپؐ کو اس امر کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے یہ فرمایا:

[1] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب وجوب امتثال ما قاله شرعا الخ، ج۲، ص ۳۰۵

ان كان ينفعهم ذلك فليصنعوه فاني انما ظننت ظنا فلا تواخذوني بالظن ولكن اذا حدثتكم عن الله شيئا فخذوا به فاني لن اكذب على الله عز و جل [1]

اگر اس سے ان کو نفع ہو تو وہ اسے کریں، کیوں کہ میں نے تو اپنا ایک ظن وخیال ظاہر کیا تھا اس لیے ظن وگمان کے بارے میں تم میرا مواخذہ نہ کرو لیکن جب میں تم سے اللہ کے واسطے سے کوئی چیز بیان کروں تو تم اسے لے لو، کیوں کہ میں ہرگز اللہ پر کوئی جھوٹ نہیں گڑھوں گا۔

اور حضرت انسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں۔

انتم اعلم بامور دنیاکم [2]

تم لوگ اپنے دنیا کے معاملات سے زیادہ باخبر ہو۔

ابن اسحاق نے بھی بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بدر کے چشموں کے قریب پڑاؤ کیا تو حضرت حبابؓ بن منذر بن جموح نے آپؐ سے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول کیا آپؐ نے اپنی صواب دید سے اس منزل کا انتخاب کیا ہے یا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہاں اترنے کا حکم دیا ہے اس لیے ہم کو اس سے آگے پیچھے نہیں ہونا ہے، یا یہ رائے اور جنگی تدبیر وحیلہ ہے، آپؐ نے فرمایا یہ صرف رائے اور جنگی تدبیر وحیلہ ہے تو حضرت حبابؓ نے کہا یہ منزل مناسب نہیں ہے، یہاں سے لوگوں کو اٹھائیے تاکہ ہم حریف کے چشمے سے زیادہ قریب ہوجائیں اور وہیں پڑاؤ کریں اور اس کے پیچھے کنوؤں کو پاٹ کر ایک حوض بنائیں اور اسے پانی سے بھر دیں، اس کے بعد جب ہم دشمنوں سے جنگ کریں گے تو ہمارے پاس پینے کے لیے پانی ہوگا اور ان کے پاس پانی نہیں رہے گا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے رائے سے ایسا کیا تھا، پھر آپؐ اپنے ساتھ کے لوگوں کو لے کر چل پڑے اور دشمنوں کے قریب ترین چشمے کے پاس جاکر پڑاؤ کیا اور کنوؤں کو خشک کرنے اور اسی کنوئیں پر جہاں اترے تھے ایک حوض بنانے کا حکم دیا جو پانی سے بھر دیا گیا۔[3]

اسی طرح حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب وجوب امتثال ما قاله شرعا الخ، ج ۲، ص ۳۰۵
[2] ایضاً مگر مسلم کے یہاں امور کے بجائے امر کا لفظ آیا ہے۔ [3] سیرت ابن ہشام غزوۃ بدر الکبریٰ، ج ۱، ص ۳۷۸، مطبعہ محمد علی صبیح مصر۔

انما انا بشر وانكم تختصمون الي ولعل بعضكم ان يكون الحن بحجة من بعض فاقضي له على نحو ما اسمع فمن قضيت له من حق اخيه شيئا فلا ياخذ فانما اقطع له قطعة من النار [1]

میں ایک بشر ہوں اور تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لے آتے ہو، ممکن ہے تم میں سے بعض دوسرے سے زیادہ چرب زبان اور اپنا مدعا بہتر طور پر پیش کرنے والا ہو اور میں اس کا بیان سن کر اس کے مطابق اس شخص کے موافق فیصلہ کردوں تو میں جس کو اس کے بھائی کا کوئی حق دوں تو وہ اسے نہ لے کیوں کہ میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا دیا ہے۔

۴- اس کے بعد کتاب کی چوتھی فصل آتی ہے جس میں مصنف نے اس مصلحت پر روشنی ڈالی ہے جو نبی کی فطرت اور اس کے کلام میں ملحوظ ومرعی رکھی گئی ہے، فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے انبیا کو اپنی مخلوقات کا ہادی اور رہنما بنایا ہے اور انہیں بشریت کے جامے میں ملبوس کیا ہے اور ان کے اندر رحمت وغضب، حسرت والم، تنگی وندامت، قلق اور گناہ کے احساس اور توبہ وتضرع کے میلانات وجذبات رکھے ہیں تاکہ وہ اپنے پیروؤں کے موافق ہوں اور ان سے ان کے پیرو متاثر ہوسکیں اور اگر نبی ملائکہ کی طرح عواطف وجذبات سے خالی رہتا تو لوگوں پر اس کی بات کا اثر نہ ہوتا کیوں کہ ایسی صورت میں اس کی بات مجرد خبروں اور تاریخی روایتوں کی طرح ہوکر رہ جاتی اور وہ جذبہ وسطوت سے عاری ہوتی، ایسی ہی مصلحت وحی کی زبان میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے، نبی تمہیں خوش، راضی، غضب ناک، سرزنش کرنے والا اور انتقام لینے والا اس لیے دکھائی دیتا ہے تاکہ لوگ اس کے کلام سے نفع اندوز ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کے لیے اس کا کلام غیر مفید اور بعید الفہم ہوجاتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا

اور اگر ہم اس (نبی) کو کوئی فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ پیدا

---

[1] مسند احمد، ج ۲، ص ۳۳۲ و سنن ابن ماجہ ابواب الاحکام باب قضیۃ الحاکم لا تحل حراما، ص ۱۶۸۔

يَلْبِسُوْنَ (۹:۶) — کررہے ہیں ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے۔

البتہ بعض انبیا ملائکہ سے زیادہ مشابہ تھے، جیسے حضرت یحییٰؑ تو ان سے بہت کم لوگ فیض یاب ہوسکے اور بعض انبیا صرف اتمام حجت کے لیے تشریف لائے جیسے حضرت عیسیٰؑ......۔

کلام وحی میں مخاطب کی رعایت ہی کی وجہ سے کبھی کبھی وہ مالوف طریقہ سے ہٹا ہوا ہوتا ہے، ایسا ہر بلیغ وحکیم اور دانا بھی کرتا ہے، یہ ایک مستقل اور عظیم الشان باب ہے۔

ایک مہتم بالشان مسئلہ یہ ہے کہ وحی کا خاص اور بڑا مرکز توجہ رب تعالیٰ کی صفات ہیں، اب اگر نظر وتوجہ ان کے کسی ایک ہی جانب اور گوشے پر مرکوز رہ جائے اور وہی قلب ودماغ پر حاوی اور غالب رہے اور دوسرے گوشوں اور پہلوؤں سے انسان کو غافل کردے تو یہ بڑی خطرناک بات ہوگی، اس لیے اس کی پردہ کشائی اس قدر ضروری ہے جو دلوں کو زیغ اور کجی میں مبتلا اور عقل کو مدہوش نہ ہونے دے۔

اب درج ذیل آیات پر غور وتامل کرو۔

۱- غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۱:۷) — جن پر نہ غضب ہوا اور نہ جو گم راہ ہوئے۔

۲- فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ (۳۰:۷) — خدا نے ایک گروہ کو ہدایت بخشی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہوگئی۔

۳- وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷:۷۶) — اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا ہول ہمہ گیر ہوگا۔

۳- اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (۱۱-۱۰:۷۶) — ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے اندیشہ ناک ہیں جو نہایت ترش رو اور سخت گراں ہوگا تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچایا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔

ان آیتوں میں حقیقت کی رعایت کرنے کی وجہ سے رب تعالیٰ کی صفت رحمت عامہ کو ظاہر کیا گیا ہے اور اس کی جانب غضب وعبوس کی نسبت سے صرف نظر کیا گیا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ

کے تمام اسما اس کی رحمت ہی پر دلالت کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا:۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۵۰-۴۹:۱۵) — میرے بندوں کو آگاہ کردو کہ بے شک میں بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہوں اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے۔

اس طرح کی بہت ساری آیتیں ہیں، بندوں کے حالات کی رعایت کے باوجود قوارع وزواجر سے انہیں خطاب اسی لیے کیا گیا ہے کہ وہ دھوکے اور فریب میں پڑ کر اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈال دیں، اللہ تعالیٰ کمال رافت کے باوجود سراپا حق صریح ہے اور وہ انصاف سے فیصلہ کرتا ہے، وہ حق کے سوا کچھ نہیں جانتا اور جو کچھ کرتا ہے اپنے علم کے مطابق ہی کرتا ہے، اس پر دوسری جگہ مفصل بحث ہوگی۔

نبی کسی قوم میں اس لیے مبعوث کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی اصلاح کرے اور اسے صراط مستقیم کی دعوت دے، اس لیے اس کو شکل وہیئت، مزاج وطبیعت اور عادات وشمائل کے لحاظ سے اپنی قوم جیسا ہی ہونا چاہیے، اگر ایسا نہ ہو تو یہ بعثت کی حکمت کے خلاف ہوگا، جیسا کہ فرمایا:۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ (النبی) مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (۹:۶) — اور اگر ہم اسے (یعنی نبی) کو فرشتہ بناتے تب بھی آدمی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ کر رہے ہیں ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے۔

اس اصول سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ نبوت کے لائق اور سزاوار وہی ہوتا ہے جو خلق وعادت میں بھی اس قوم کے جس میں اس کی بعثت ہوئی ہے زیادہ قریب ہوتا ہے، ورنہ لوگ اس سے بالکل متنفر اور بیزار ہوجائیں گے، نبی کے باب میں اگر اس حکمت کی رعایت نہ کی گئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انبیا کو اس کا حکم نہ دیتا کہ وہ اپنی قوم کو نرم، موثر اور بلیغ انداز میں مخاطب کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی قوم کے مذموم اخلاق وعادات سے نبی بہت دور ہوتا ہے، اسی کے مدنظر علما نے اس کی قوم کے برے اور معیوب حالات بیان کرنے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے، اس سے ان کا مقصد یہ دکھانا ہوتا ہے کہ نبی کی ضرورت کتنی شدید اور اس کا اثر کس قدر

غیر معمولی ہوتا ہے گویا وہ مس خام کو کندن بنانے میں اکسیر کا کام کرتا ہے یا بادل کی طرح مردہ اور خشک زمین کو زندگی اور شادابی بخشتا ہے، ان کی یہ بات بالکل درست ہوتی بشرطیکہ انہوں نے اس سلسلے میں اس ضروری اور بڑے عنصر کو ترک نہ کردیا ہوتا کہ محاسن میں اپنی امت سے نبی کی بڑی قربت اور مشابہت بھی ہوتی ہے۔

۵- پانچویں فصل میں مصنف یہ واضح کرتے ہیں کہ نبی اور اس کی امت کے درمیان کیا مماثلت ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی اپنی قوم کا خلاصہ اور اصل جوہر ہوتا ہے، جیسے کسی درخت کی شاخ سے کوئی کلی نکلتی ہے یا کسی پتھر کے جگر سے کوئی جوہر برآمد ہوتا ہے، اسی طرح قوم کے اندر متفرق طور پر جو خوبیاں پائی جاتی ہیں، نبی ان سب کا جامع ہوتا ہے اور ان کی گندگی و آلایش سے پاک ہوتا ہے، یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہر قوم کے اندر جس طرح گوناگوں محاسن پائے جاتے ہیں اسی طرح متعدد عیوب اور خرابیاں بھی اس میں ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی مختلف النوع مخلوقات میں بھی تمہیں یہی چیز نظر آئے گی اور یہ بات فطرت کے قوانین سے جس طرح قریب تر ہے اسی طرح حکمت سے بھی نزدیک تر ہے اور فطرت و حکمت کی طرف نبی سب سے زیادہ سبقت کرتا ہے اور وہ اپنی قوم کا سب سے شریف اور پاک باز شخص ہوتا ہے، اس سے مومنین سابقین کی بھی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جب افق سے نور نکالتا ہے تو سب سے پہلے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں روشن ہوتی ہیں، پھر جو جتنا قریب ہوتا ہے وہ اسی قدر جلد روشن ہوتا ہے یا جب وہ پانی آسمان سے برساتا ہے تو سب سے پہلے زیادہ زرخیز زمین ہری بھری ہوتی ہے، نبی کی ذات کے بارے میں بھی امت کی بیداری کی یہی کیفیت ہوتی ہے، پھر صدیقین، شہدا، صلحا اور ان کے اتباع کا نمبر آتا ہے اور جب نشوونما کا زمانہ مکمل ہوجاتا ہے تو دانے جمع کرلیے جاتے ہیں اور بھس پھینک دیا جاتا ہے۔

(۲) اس سے تم پر صبر کی حکمت واضح ہوتی ہے جس کی نبی اور اس کے اصحاب کو سخت تاکید کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ منافقوں اور کافروں کی جماعت کا کوئی بھی ایسا شخص ان کے ساتھ باقی نہ رہ جائے جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہو، غرض جب اللہ تعالیٰ مومنین کو اچھی طرح صاف اور پاک کرلیتا ہے تو کافروں کو ہلاک کردیتا ہے، اس تمحیص و تنقیہ کے نتیجے میں خود

مومنین کے گروہ سے وہ لوگ نکل اور چھٹ جاتے ہیں جو نور بصیرت کے بغیر ان میں شامل ہوگئے تھے، قرآن مجید میں کئی جگہ اس کی صراحت کی گئی ہے، اس کی کسی قدر تفصیل معجزات کے بیان مین بھی آئے گی۔

(۳) نبی چوں کہ اپنی قوم کا حاصل اور خلاصہ ہوتا ہے اس لیے وہ اور اس کی قوم دو آئینوں کی طرح ہیں جو تمہارے دو کناروں پر ہوں، جن میں بعض کی جھلک تم کو بعض میں دکھائی دیتی ہے، پس اگر نبی ہمت اور کوشش و تدبیر کے انتہائی اعلا درجے پر نظر آئے تو تم کو اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ اس کی قوم آزاد اور زود فہم ہے، اسی طرح اگر اس کی قوم اچھے اور عمدہ اخلاق والی دکھائی دے تو تم یقین کرلوگے کہ اس کا نبی مجسم حسنِ اخلاق ہے، اس کی وجہ سے کسی قوم اور اس کے نبی کی سیرت کو سمجھنے کی کلید تمہارے ہاتھ آجاتی ہے جس سے ان دونوں میں سے کسی سے بھی دوسرے کا پتا چلاسکتے ہو اور اسی ذریعے سے تم کسی قوم کی شریعت کو بھی سمجھ لوگے، کیوں کہ نزولِ شریعت امت کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں تورات، انجیل اور قرآن کے نازل کیے جانے کے ذکر کے بعد فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۴۸:۵)	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھرایا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنادیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمہاری آزمایش کرے جو اس نے تم کو بخشی، تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے عموم کے مطابق سورۂ انعام کے آخر میں آیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَآئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتَاكُمْ (۱۶۵:۶)	اور وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے۔

اللہ امتوں کی آزمایش اسی چیز میں کرتا ہے جو ان کو اس نے عطا کی ہے، اسی لیے اس نے ہر امت کے حال کے مطابق اس کے شرائع بنائے ہیں اور اسی اعتبار سے ان میں ان کا اختلاف ہے اور سب سے کامل شریعت سب سے کامل امت کے لیے آئی ہے۔

(۴) [illegible] یہ بتایا ہے کہ امت پر نبی کی اطاعت واجب ہوتی ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ نبی اپنی قوم کا حساس قلب ہوتا ہے اور اس کی حیثیت قوم کے اندر کان، آنکھ اور دل کی ہوتی ہے، چنانچہ جس طرح ان پر اپنے قلب کے نور کی اطاعت لازم ہے، اسی طرح ان کی جماعت پر اپنے نبی کی اطاعت واجب ہے لیکن جس طرح فاجر اپنے نورِ قلب کا مخالف ہو جاتا ہے اور فجور کو جاننے کے باوجود اپنی شہوات کی طمع میں گرفتار رہتا ہے، اسی طرح فُجّار بھی نبی کی رائے کی صحت، خیر خواہی اور مودت کو جاننے کے بعد بھی اس کی نافرمانی کرتے ہیں اور قرآن مجید اور صحیح حدیث میں بھی اس کی صراحت کی گئی ہے کہ کفار ظلم و سرکشی کی بنا پر ان چیزوں کو بھی جن پر ان کو یقین ہوتا ہے جھٹلاتے ہیں۔

۶- چھٹی فصل نزول الوحی بکلام مسموع میں لکھتے ہیں:۔

کیا تمھیں اس کا اتفاق ہوا ہے کہ تم کوئی نام یا کسی چیز کو جسے جانتے تھے بھول گئے اور اب اسے یاد کرنا اور بیان کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ ایسے موقع پر کیا کرتے ہو، کیا تم اپنی فکر کو بھولی ہوئی چیز کے باطن کی طرف لوٹا کر اسے معلوم کرنے کا خالص و مصمم ارادہ نہیں کرتے؟ تو یہی قوائے فکریہ تمھارے پاس خبر لاتی ہیں حالاں کہ تمھیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ تمھارے پاس کیسے آجاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم نے کوئی جاسوس بھیجا تھا جس نے تمھارے خزانے کی تفتیش کی اور اس چیز کو حاصل کر لیا جسے تم نے اس سے دریافت کیا تھا اور اس نے وہ لا کر تمھیں بخش بھی دی، شعر یا مسجع و مقفی کلام کہنے والا بھی یہی کرتا ہے، وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے قبل اس کے کہ اسے جانے اس کے باطن کی طرف متوجہ ہوتا اور اپنے ارادے کو مصمم کرتا ہے۔

بعض اوقات ایک فارسی شخص کو عربی زبان میں کم مہارت کے باوجود جب کسی عربی شخص سے بات کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ مثلاً لفظ نعم کا مفہوم ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کی زبان پر سبقت کر کے "بلے" آجاتا ہے، یہ اس بنا پر کہ اس کی توجہ معنی و مفہوم کی طرف مرکوز ہوتی ہے حالاں کہ

اس کی فکر مفہوم ادا کرنے کے لیے کسی اور لفظ اور زبان کا عادی ہوتا ہے پس وہ پہلے ہی وہ بات کہہ جاتا ہے جس کے کہنے کا اس کے قایل کا ارادہ نہیں تھا، گویا تمھارے اندر کوئی متکلم ہوتا ہے جو تمھاری زبان پر وہ بات القا کر دیتا ہے ابھی جس کا تمھارا صرف ارادہ ہی تھا، اس کی زیادہ واضح مثال برجستہ تقریریں، خطبے اور فی البدیہہ اشعار ہیں، خطیب برجستہ تقریر میں لگاتار ابلتے اور زیادہ پانی والے چشمے کی طرح ہو جاتا ہے، چنانچہ جیسے ہی ایک بات وہ کہتا ہے اس کے معاً بعد ہی دوسری بات استدلال، جواب اور تمثیل کے ساتھ آجاتی ہے، جو لوگ اس میدان میں آزمودہ کار ہو جاتے ہیں وہ وقت سے پہلے کچھ سوچتے بھی نہیں، عین وقت پر تقریر شروع کر دیتے ہیں اور شروع کرتے ہی ان کے خزانے کا سارا ذخیرہ کھل جاتا ہے، اسی بنا پر حضرت مسیح نے اپنے حواریوں سے فرمایا تھا کہ جب تمھیں امرا اور جبابرہ کے یہاں بلایا جائے تو جو کچھ تم کو وہاں کہنا ہے اس کے لیے پہلے سے نہ تیاری کرو اور نہ سوچو، کیوں کہ عین وقت پر روح القدس تمھاری مدد فرمائے گا۔

بعض اوقات بخار میں مبتلا شخص خواب دیکھتا ہے کہ وہ کسی بیابان میں ہے، اسے سخت پیاس لگی ہوئی ہے، بہت دور پر کوئی چھوٹا سا تالاب ہے، اس لیے اس کی طرف تیزی سے جاتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو اسے ایک چمک دار سراب دکھائی دیتی ہے، گویا پیاس نے اس کے تصور و تخیل میں اس کی معتاد چیز کو یاد دلایا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح تمھارے اندر کوئی مصور ہوتا ہے اسی طرح کوئی متکلم بھی ہوتا ہے، کبھی ہم خواب میں بہت طویل گفتگو سنتے ہیں اور اسے سمجھ کر اس کا جواب بھی دیتے ہیں، کبھی کوئی شعر اور بلیغ خطبہ سنتے ہیں اور جو کچھ سنتے ہیں اس کا کہنے والا سوائے ہمارے باطن فکر کے اور کوئی نہیں ہوتا۔

(۲) اگر تم ان اُمور کو تصور و خیال میں لاؤ اور ان پر غور کرو تو تمھیں یقین ہو جائے گا کہ باطنِ فکر میں کلام پیدا ہوتا اور نشو و نما پاتا ہے اور کبھی کبھی متکلم کا ارادہ بہت سادہ سا ہوتا ہے مگر جب اس کے اندر حفظ، تخییل و ترتیب کی قوتیں حرکت کرنے لگتی ہیں تو وہ ایک اچھا کلام تیار کر دیتا ہے یا کمالِ صحت کے ساتھ کوئی یاد کیا ہوا کلام پڑھنے لگتا ہے حالاں کہ دور تک غور و فکر کے باوجود اسے اس کا پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ شعور کے پیچھے فکر کا ایک مرتب عمل ہوتا ہے اور ارادے اور فعل کے

ظہور کے درمیان کچھ مخفی اعمال ہوتے ہیں، مثلاً جب تم کھانا اور چبانا چاہتے ہو تو اعضا و جوارح اور ہڈیاں اور زبان حرکت کرنے لگتی ہیں، حالانکہ تم کو اس کا احساس و شعور نہیں ہوتا، تمہارا تو صرف ایک ارادہ ہوتا ہے، غرضے کہ جس طرح یہاں اعضا کی حرکتیں ہوتی ہیں، اسی طرح وہاں عقلی قوتوں، حافظہ و خیال وغیرہ کی حرکتیں ہوتی ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی بھی عقل و جسم کے ساتھ ساتھ عمل سے خالی نہیں ہوتی۔

(۳) اعمال خواہ جسم کے ہوں یا عقل کے، جس طرح ان کا صدور باطن سے ظاہر کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح عادت اور مشق کے بعد وہ بہ تدریج ظاہر سے باطن کی طرف آتے ہیں کیونکہ مشق و عادت ان کو ہانک کر شعور کے پیچھے لے جاتے ہیں، ابتدا میں ہر عمل اس سے زیادہ ہمت و توجہ کا طالب ہوتا ہے جتنا مشق کے بعد ہوتا ہے بلکہ اس وقت ہمت کم کیا سرے ہی سے غایب ہو جاتی ہے مگر صرف شعور سے غایب ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کے پیچھے آگے ہی بڑھتی رہتی ہے، ارادے کا محل اور افعال کا منبع یہیں ہوتا ہے، جو عمل ملکہ و عادت بن جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ ظاہر سے باطن کی طرف بڑھتا ہے اور ارادہ کرتے ہی افعال نتایج کی طرح تم کو مل جاتے ہیں اور تم کو پتا نہیں چلتا کہ تمہارے باطنی قوی کی اس میں کیسی کارفرمائی ہوتی ہے، اس کے ساتھ یہی باطن اس چیز کو اخذ کر لیتا ہے جو تمہارے فکر باطن میں مخزون ہوتی ہے۔

(۴) ارادے کا منبع کبھی وحی اور روح القدس کی جلوہ گاہ ہوتی ہے تو وہ باطن میں ایسا کلام وجود میں لاتا ہے جو ان باتوں اور صورتوں کو اخذ کر لیتا ہے جو آدمی کے ذخیرے میں ہوتی ہیں اور آدمی کو اس عمل کا احساس نہیں ہوتا، چنانچہ وہ اپنی قوم کی زبان میں اس کے عادی کلام کے اسلوب میں کوئی کلام سنتا ہے لیکن جو پاک روح قدسی اس کی وحی کرتی ہے وہ خواہشات کے دروازے بند کر دیتی ہے اس لیے وہ اپنے علمی خزانے سے وہی چیزیں لیتا ہے جو اس کے حسب حال اور موزوں ہوتی ہیں، جس طرح اچھا بیج پاکیزہ زمین سے بہتر چیزوں کو لیتا ہے اور پاکیزہ کلیاں دکھاتا ہے اور جیسے شہد کی مکھیاں پھولوں اور پھلوں سے طیب اور شفا بخش چیزوں ہی کو منہ لگاتی ہیں اور آگ عمدہ لکڑی کو جلاتی ہے تو اس کی اچھی خوش بو پھیل جاتی ہے۔

(۵) ہماری اس تقریر سے دو نتیجے برآمد ہوئے ایک تو یہ کہ مقدس و برتر کلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاکیزہ اور مبارک قلب سے نکلا ہو، اسی لیے انبیا کو ان کی استعداد و قابلیت کے بلند مدارج اور علوے اخلاق کے مطابق جو وحی کی گئی ہے اس میں ہم کو عظیم فرق نظر آتا ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کی طرف وحی کی جاتی ہے، الفاظ و کلمات اسی کے خزانۂ فکر

کے مطابق ہوتے ہیں اور کلام کی ترتیب اس کے اس باطن سے ہوتی ہے جو روح مقدس کے تصرف کے تحت ہے، رویائے صادقہ کا بھی یہی معاملہ ہے، ان میں وہی صورتیں نظر آتی ہیں صاحب رویا جن کا عادی ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس میں جو چیز بھی ہوتی ہے وہ اللہ کی اجازت سے ہوتی ہے اور تمثیلات، تشبیہات اور کلام کے سارے اسالیب اسی زبان کے نہج و اصول کے مطابق ہوتے ہیں جس زبان میں وحی کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کو وحی ایسی زبان اور لفظوں میں نہیں کی جاتی جو اس کی فکر سے بعید ہو، اگر ایسا کبھی ہوا ہے تو وہ صرف شاذ و نادر یا کسی خاص حکمت و مصلحت کی بنا پر جیسا کہ بیلشاصر بن بخت نصر کے واقعے میں تم دیکھتے ہو کہ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے اس کے محل کی دیوار پر کوئی کلام تحریر کیا جسے سوائے دانیال نبی کے اور کوئی سمجھ نہیں سکا، مختلف اور بعید زمانوں میں منزل وحی میں اسلوب کا جو تفاوت ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ مخاطب کے حال کی رعایت کا اقتضا ہوتا ہے، تصنیف کے اوقات میں بعد ہوتا ہے تو یہی فرق مصنفین کے کلام میں بھی ہو جاتا ہے مگر یہ فرق روح القدس کی جانب سے وحی کے ہونے کے خلاف نہیں ہے۔

(۶) لغت اور اسلوب کے اعتبار سے وحی کی زبان میں اختلاف کے باوجود تمہیں اصول میں اختلاف نظر نہیں آئے گا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے خواہ حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی ہو یا حضرت عیسیٰؑ یا حضرت محمد ﷺ پر، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۸۲:۴)

اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بڑا اختلاف پاتے۔

اسی لیے بعض وحی بعض کی تصدیق کرتی اور ایک دوسری کو مضبوط و مستحکم کرتی ہے، حکیم و دانا کتب مقدسہ کے بعض حصوں کی تاویل بعض حصوں سے کرتا اور بعض کو بعض سے سمجھتا ہے، قرآنی آیات کی تفسیر میں بھی وہ اسی اصول کو مضبوطی سے پکڑتا اور اسے دوسرے اصولوں پر مقدم قرار دیتا ہے، کیوں کہ یہ قطعی اور ایک ہی جنس سے ہے، ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو اسلوب کے اختلاف کو نبی کے حالات کے اختلاف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، کیا اللہ کی کاریگری میں رنگوں، صورتوں اور طبیعتوں کا اختلاف انہیں نظر نہیں آتا، جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِيْنَ (۳۰:۲۲)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کا تنوع بھی ہے، بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں اصحاب علم کے لیے۔

۷- ساتویں فصل میں فطرت سے وحی مسموع کی مطابقت و موافقت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اللہ تعالیٰ کا مسموع کلام نبی کے پاس اس وقت آتا ہے جب اس کے قلب کی اصلاح ہو چکی ہوتی ہے، جس طرح بیج زمین میں اس وقت ڈالا جاتا ہے جب وہ ہموار اور درست کر لی جاتی ہے، نبی کے شرح صدر اور سینے کے دھونے کی بھی یہی تاویل ہے، اسی لیے انبیا کے واقعات و قصص میں تمہیں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہیں اپنے رب کی جانب سے دلیل و بصیرت ملنے کے بعد وحی سے سرفراز کیا جاتا ہے اور جب وہ حق و باطل میں فرق و امتیاز سے واقف ہو جاتا ہے تو اس کے پاس وحی اس چیز کی شاہد بن کر آتی ہے جو.... اس پر ظاہر ہو چکی ہے، جیسا کہ سورۂ ہود میں نبیوں کے قصوں میں یہی بات اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے:

أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ
وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتَابُ مُوْسٰى
إِمَامًا وَّرَحْمَةً أُولٰئِكَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ
(۱۱:۱۷)

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک برہان پر ہے، پھر اس کے بعد اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آجاتا ہے اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے (اور وہ جو نور بصیرت سے محروم ہیں دونوں یکساں ہو جائیں گے) اس پر ایمان تو وہی لوگ لائیں گے۔

یہ آیت حضرت محمد ﷺ کے متعلق تھی پھر حضرت نوحؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى
بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَآتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ
عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا
وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ (۱۱:۲۸)

اس نے کہا اے میرے ہم قوم! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی مجھے نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بیزار بھی ہو!

اور حضرت صالحؑ کے بارے میں کہا:

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ
عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَآتَانِيْ
مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ
مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهٗ
(۱۱:۶۳)

اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمتِ خاص سے بھی مجھے نوازا تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔

اور حضرت شعیبؑ کے بارے میں آتا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى
بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا
حَسَنًا وَمَا أُرِيْدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ
إِلٰى مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ
(۱۱:۸۸)

اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مزید اپنی جانب سے مجھے رزق حسن سے بھی نوازا (تو اس کے سوا میں تمہیں اور کس چیز کی دعوت دوں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کرکے وہی چیز خود اختیار کروں جس سے تمہیں روک رہا ہوں۔

ان آیتوں میں بینہ کے بعد وحی آنے کا ذکر ہے اور وحی کی تعبیر شاہد، رحمت اور رزقِ حسن سے کی گئی ہے، ان تعبیرات کے شواہد قرآن مجید اور صحف اولیٰ میں موجود ہیں۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا اس سے دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں، اول یہ کہ نبی کی نگاہِ بصیرت جن چیزوں کو دیکھ رہی ہے، وحی اس کے پاس اس کی تائید و توضیح کے لیے آتی ہے جس سے اس کے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، اسی طرح دانش ور اور ارباب عقل و بصیرت بھی اللہ کی آیتوں پر اس لیے ایمان لاتے ہیں کہ فطرت کی جانب سے ان کو جو الہام کیا گیا ہے، وحی اس کی موید ہوتی ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّقُوْلُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ إِيْمَانًا فَأَمَّا
الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَّ
هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ وَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا سو جو سچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں،

قلوبہم مرض فزادتہم رجسا الی رجسہم (۹: ۱۲۴-۱۲۵) — رہے وہ جن کے دلوں میں روگ ہے تو وہ ان کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیتی ہے

اسی لیے اللہ نے اپنی آیتوں کو "ذکریٰ للناس" (لوگوں کو یاد اور چیت دلانے والی) کا نام دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فطری علم و اشارہ کے بہ موجب جس کا قلب پاک ہوتا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے وحی اس کے موافق اور اس میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا:

والذین اہتدوا زادہم ہدیٰ (۴۷: ۱۷) — اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی۔

نیز فرمایا:

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُہُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْلِیَاؤُہُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَہُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمَاتِ (۲: ۲۵۷) — اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں، وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔

پس اسے سمجھنے کی ضرورت ہے، اسی فصل کے ضمن میں وحی عام جسے اصطلاحاً الہام کہا جاتا ہے، اس کے متعلق یہ نوٹ اور اشارات ملتے ہیں:۔

وحی انبیا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اکثر لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، تم خود بھی اپنے قلب کے اندر کسی حکم دینے والے اور منع کرنے والے کو پاتے ہو لیکن کبھی جہل اور ناواقفیت کی بنا پر انسان کا فعل و عمل گناہ سے ملوث ہو جاتا ہے جیسے جھوٹی شہادت کی بنا پر ایک عادل بھی جور اور زیادتی کا حکم دے دیتا ہے، بہر حال یہ وحی کی جنس عام ہے۔

انبیا کو جس طریقے پر وحی کی جاتی ہے وہ طریقۂ وحی لوگوں کو نہیں بخشا گیا ہے، اسی بنا پر فرق و امتیاز کے لیے لوگوں نے وحی عام کو الہام کا نام دیا ہے لیکن قرآن مجید نے علم فطری کو الہام کے نام سے موسوم کیا ہے، جیسا کہ فرمایا:

فالہمہا فجورہا وتقواہا (۹۱: ۸) — پس اس کو الہام کیا (سمجھ دی) اس کی بدی اور نیکی کا۔

(باقی)

بیسویں صدی میں عربی کی مغربی شاعری

از ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی ☆

مصر کی مغربی سرحد مشرق اور مغرب کے درمیان حد فاصل سمجھی جاتی ہے، یہ سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے علاقہ مغرب کی سرحد شروع ہوتی ہے، اگرچہ لیبیا اور موریتینیا بھی مغرب میں شامل ہیں لیکن مغرب کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے المغرب الادنیٰ، المغرب الاوسط، المغرب الاقصیٰ، تونس کا علاقہ المغرب الادنیٰ کہلاتا ہے اس لیے کہ وہ مشرق سے قریب ہے اور الجزائر کا علاقہ المغرب الاوسط کہلاتا ہے اس لیے کہ وہ درمیان میں ہے اور مراکش کا علاقہ المغرب الاقصیٰ کہلاتا ہے اس لیے کہ وہ مشرق سے سب سے زیادہ دور ہے، ماضی بعید میں یہ تصور تھا کہ مشرق میں جو سورج طلوع ہوتا ہے وہ بحر اوقیانوس کے ساحل میں غروب ہو جاتا ہے، عربوں کے اسی تصور نے بحر اوقیانوس کے ساحل سے قریب علاقہ کو مغرب سے تعبیر کیا اور آج تک یہ پورا علاقہ مغرب ہی کہلاتا ہے اگرچہ موجودہ دور میں پورا مغرب سیاسی اعتبار سے کئی حصوں میں منقسم ہے۔

سیاسی اور ثقافتی حالات کی وجہ سے عالم عرب مشرق و مغرب دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے، مشرق میں سیاسی، ثقافتی اور دینی اعتبار سے جس قدر تبدیلیاں ہوئیں، مغرب میں اس قدر تبدیلیاں نہیں ہوئیں، مشرق میں فارسی، رومی، قبطی، ترک اور دوسری اقوام بہت کثرت سے عربوں میں شامل ہوئیں، مغرب میں اس قدر اقوام اور شعوب و قبایل کا اختلاط نہیں ہوا، اس لیے مغرب کو اسلامی مغرب ہی کہا جاتا ہے، وہ بربر یا عربی نہیں کہا جاتا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یمن سے ہی عرب جا کر کبھی مغرب کے علاقوں میں آباد ہوئے تھے، اس لیے وہ بھی عرب ہی تھے اور وہاں

☆ استاذ شعبۂ عربی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز، حیدر آباد۔

فقہی مذاہب میں صرف مالکی مذہب ہی کو فروغ ہوا، کچھ حنفی بھی پائے جاتے ہیں لیکن قلت تعداد کی وجہ سے بالکل غیر موثر ہیں، استعماری طاقتوں اٹلی اور فرانس نے وہاں کی زبان وتہذیب ہر چیز بدلنے کی کوشش کی اور فرانسیسی زبان وتہذیب کا تو یہ دوسرا مرکز ہوگیا تھا، لیکن اس کے باوجود فرانسیسی نسل کے لوگ مغاربہ نہیں کہلا سکے اور نہ ہی ان کی زندگی مغاربہ سے ہم آہنگ ہوسکی، مغاربہ کی اپنی شناخت ہے جو ہزار خرابیوں کے باوجود باقی ہے۔

فرانس نے ۱۸۳۱ء میں الجزائر پر ۱۸۷۳ء میں مراکش پر اور ۱۸۸۱ء میں تونس پر غاصبانہ قبضہ کیا، آزادی کی جدوجہد اور بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد مراکش ۱۹۵۵ء میں تونس ۱۹۵۶ء میں اور الجزائر ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا۔

جس طرح مشرق کی چمک دمک کی وجہ سے اس کی معمولی چیزیں بھی چمک دار نظر آتی ہیں اور اس کے مقابلے میں مغرب کے قیمتی سے قیمتی جواہر ریزے کو روکھا پھیکا خیال کیا جاتا ہے، یہی حال اس کی شاعری اور ادب کا بھی ہے، نقادوں نے چوں کہ خاص عینک لگا رکھی ہے اس لیے مشرق کی شاعری کے ذخیرے میں لعل وگوہر جگمگاتے اور چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن مغرب کے لعل و جواہر بھی دھندلے اور سنگ ریزے محسوس ہوتے ہیں، نہ وہ اسے قابل اعتنا سمجھتے ہیں اور نہ انہیں مغربی شاعری میں فکر وخیال کی جدت وتابانی اور اسلوب کی نزاکت اور رعنائی نظر آتی ہے، اسی لیے صالح الجابری نے تونس کی جدید شاعری اور شاعر کے متعلق یہ تحریر کیا کہ ''تونس کے ہر شاعر نے تاریخی اعتبار سے گوشۂ گمنامی میں زندگی گذاری اور وراثت میں ناقدری اس کے مقدر میں رہی'' (محمد الجابری، دیوان الشعر العربی الحدیث، ص ۷)، ابوالقاسم سعد اللہ نے اپنی کتاب الادب الجزائری الحدیث میں تحریر کیا ''بیسویں صدی میں مغرب، الجزائر اور تونس میں جو فکری ادبی اور ثقافتی تحریکیں وجود میں آئی ہیں، عربی لٹریچر میں ان کے ساتھ تکلیف دہ حد تک بے اعتنائی برتی گئی ہے'' (مقدمہ) اور ڈاکٹر محمد علی الرباوی نے مراکش کی شاعری کی طرف عدم توجہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ''مغربی مطبوعہ مصادر و مراجع کا بیشتر حصہ ایک مخصوص طبقہ تک ہی محدود رہا اور وہ پوری طرح منظر عام پر نہیں لایا گیا، اس کی بنا پر محققین اور اسکالر سمجھتے ہیں کہ مغرب کا مطبوعہ لٹریچر اور ادبی ذخیرہ بہت کم ہے'' (تقدیم، ببلوغرافیا الشعر العربی الحدیث بالمغرب

لمحمد قاسمی و احمد سیحال، ص-ہ)۔

مشرق کے ادیب و نقاد اور شعرا نے جس قدر تعریف وتوصیف کے ساتھ مشرق کی جدید شاعری کے خزانے کو پیش کیا، اس کا عشر عشیر بھی مغرب کی جدید شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ کیا، اس کے دو اسباب ہیں ایک تو اہل مشرق کا احساس برتری، دوسری وجہ یہ ہے کہ جن شعرا کے کلام تک ان کی رسائی ہوئی وہ بہت محدود تھی، احساس برتری اور تعصب کی ایک مثال ملاحظہ ہو: شاذلی خزن دار جو تونس کے ایک عظیم شاعر ہیں اور اپنی شعری خصوصیات کی وجہ سے تونس کی سرزمین کے امیر الشعرا کہلانے کے مستحق ہیں، ان کے متعلق ڈاکٹر الطاہر احمد مکی الشعر العربی المعاصر میں لکھتے ہیں:

''اہل تونس محمد الشاذلی خزن دار (۱۳۹۹ھ) کو سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں اور اس کو امیر الشعرا مانتے ہیں گو یہ بجا ہے کہ اس نے جمود وتعطل کے دور کی شاعری کے موضوعات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے تاہم اس کی شاعری حسن اور پختگی سے خالی ہے''۔

(الطاہر احمد مکی، الشعر العربی المعاصر، ص ۱۲۱)

تاریخ الشعر العربی الحدیث اصلاً تذکرہ کی کتاب ہے مگر اس میں تنقیدی مواد بھی شامل ہے اور ہندوستان میں عام طور سے رائج ہے، اس کا مصنف احمد قبش لکھتا ہے کہ ''مغرب کی شاعری میں خیالات کی بلندی نہیں پائی جاتی، عربیت کی کمزوری کی وجہ سے زبان اور اسلوب کا کوئی اعلی معیار نہیں ملتا، احمد قبش نے صرف جدید کلاسیکی شعرا کے ذکر پر اکتفا کیا ہے اور جدید افکار وخیالات کے حامل نئے لب ولہجہ کے شعرا کا ذکر نہیں کیا ہے، دوسرے ناقدوں نے بھی مغربی شاعری کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہے، انہوں نے مغرب کی جدید عربی شاعری کے مکمل مطالعہ کے بغیر احساس برتری کی بنا پر مغرب کی جدید اعلیٰ شاعری کو بھی بہت ہی کمتر درجہ کی شاعری گردانا ہے حالاں کہ خیالات اور افکار کی بلندی، زبان میں شگفتگی و رعنائی، نئے مضامین و معانی، خوبصورت اور دل کش اسلوب سے مغرب کی شاعری بھی مالا مال ہے اور وہاں کے جرائد و مجلات میں منتشر تنقیدی مضامین بھی ہیں، قدر و قیمت کے اعتبار سے مشرق سے کسی طرح کم نہیں ہیں مگر سیاسی حالات اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے ان کا ادبی وتنقیدی سرمایہ مغرب سے باہر

متعارف نہیں ہوسکا، میرے محدود مطالعہ میں جدید مغربی شاعری کی جو تنقیدی کتابیں آئی ہیں، ذیل میں ان کی مختصر فہرست درج کرتا ہوں:۔

۱-محمد الفاضل بن عاشور	الحرکۃ العربیۃ والفکریۃ فی تونس
۲-محمد صالح الجابری	الشعر التونسی المعاصر
۳-ایضاً	دیوان الشعر التونسی المعاصر
۴-عمر فروخ	شاعر الحب والحیاۃ
۵-عبد الحفیظ محمد حسن	الشاعر الرومانی ابو القاسم الشابی
۶-نعمات احمد فواد	شعراء ثلاثۃ......ابراہیم ناجی، ابو القاسم الشابی، الاخطل الصغیر
۷-ابو القاسم محمد کرو	الشابی فی مرآۃ معاصریہ
۸-ابو القاسم سعد اللہ	دراسات الادب الجزائری الحدیث
۹-محمد الہادی الزاہری	شعراء الجزائر فی العصر الحاضر
۱۰-ڈکتور محمد ناصر	الشعر الجزائری الحدیث
۱۱-الدکتور صالح خرفی	المدخل الی الادب الجزائری الحدیث
۱۲-الدکتور عبد اللہ حمادی	اصوات من الادب الجزائری الحدیث
۱۳-محمد قاسمی	بیلوغرافیا الشعر المغربی الحدیث
۱۴-الدکتور سید حامد نساج	الادب العربی المعاصر فی المغرب الاقصیٰ
۱۵-محمد بن العباس القباج	الادب العربی فی المغرب الاقصیٰ
۱۶-عبد اللہ الکنون	النبوغ المغربی فی الادب العربی
۱۷-یحییٰ جلالی	تاریخ المغرب الحدیث والمعاصر
۱۸-محجوب ...	مساہمات الاجیال السالفۃ عبر التاریخ فی بناء المغرب العربی
۱۹-الدکتور الہادی الغربی	الادب التونسی فی العہد الحسینی

تونس

اب آئیے تونس کی جدید عربی شاعری پر ایک نظر ڈالیں، اس کی ابتدا سے قبل تونسی

میں عربی شاعری زوال پذیر تھی، اس کے متعلق الجابری تحریر کرتے ہیں:۔

''بعض لوگوں کے خیال میں شعر کی کساد بازاری اور مطالعہ شعر سے عدم دل چسپی کی وجہ سے عربی شاعری انحطاط کا شکار ہوئی لیکن دراصل اس کی بنیادی وجہ عربی تہذیب و ثقافت کو مٹانے کی استعماری کوشش ہے۔ شعرا مرثیہ گوئی یا اہل ثروت و سطوت کی مداحی اور قصیدہ خوانی میں لگ گئے، اس سے الگ ہو کر جن شعرا نے شاعری کی ان کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور تاریخ ادب نے ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھا، یہ ٹریجڈی ہے''۔ (ص ۶)

تونس کی سرزمین پر محمود قابادو (۱۸۱۲-۱۸۷۱) نے سب سے پہلے عربی شاعری کو نئے دور میں داخل کرنے کی کوشش کی، قابادو کی شخصیت غیر معمولی تھی وہ اپنے وقت کے مصلح، مجدد، ادیب اور شاعر تھے، انہوں نے دینی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی رہنمائی کی، بہ حیثیت شاعر ان کا موازنہ البارودی سے کیا جاتا ہے لیکن محمود قابادو کی شخصیت البارودی سے اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ صرف شاعری اور جنگی و انقلابی حکمت عملی سے ہی واقف نہیں تھے بلکہ دینی علوم سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے قوم کے مذہبی رہنما اور قومی معاملات میں دوررس نگاہ کے حامل بھی تھے۔

محمود قابادو سے پہلے دوسرے مغربی ممالک کی طرح تونس میں بھی عربی شاعری زوال پذیر تھی اور اپنی حقیقی روح کھوچکی تھی، قصیدہ خوانی، ہجو، تفاخر اور الفاظ کی بازی گری شاعری کی شناخت بن گئی تھی، شعرا کے کلام میں معانی اور اسلوب کے اعتبار سے کوئی جدت اور ندرت نہیں تھی لیکن محمود قابادو جو اپنے دینی اور اصلاحی کارناموں کی وجہ سے ''جنون الدراویش'' کہلاتے ہیں، خانقاہی نظام سے وابستگی کے باوجود انہوں نے زبان و ادب اور شعر و شاعری کو نئی جہت دی، فرانسیسی استعماری طاقت نے عربی زبان و ثقافت، دینی روح اور اسلامی زندگی کو تباہ کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی، محمود قابادو نے مجدد اور مصلح کی حیثیت سے فرانسیسی استعمار کے خاتمے کے لیے قوم کو ابھارا اور ملٹری اسکول کے ایک استاذ کی حیثیت سے قوم کے نوجوانوں کو جنگی حکمت عملی اور انقلابی دفاعی نظام سے آشنا کیا اور اپنی شاعری کے ذریعہ نوجوانوں میں استعماری طاقت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

محمود قابادو نے دینی مضامین کے ذریعہ قوم کو نئی راہ دکھانے کی کوشش کی اور شاعری کے ذریعہ استعماری طاقت کے خلاف قومی جذبات بیدار کیے، اس طرح قابادو نے وطنی اور قومی شاعری کی بنیاد ڈالی، اس دور کی شاعری میں زبان واسلوب کی جو رکاکت پائی جاتی تھی اسے ترک کر کے عبد عباسی کی شاعری کے اسلوب کی پیروی کی اور ایک نیا اسلوب پیش کیا، جدید خیالات ومطالب کی وجہ سے قدیم اسلوب کے باوجود اس کی شاعری جدید کلاسیکی شاعری کہی جاسکتی ہے مگر محمد الجابری اسے صاحب طرز شاعر نہیں مانتے۔

نور الدین حمود نے اپنے مضمون میں تحریر کیا ''قابادو اور مصری شاعر البارودی میں بڑی مماثلت ہے دونوں نے جدید عصری موضوعات کی شاعری کو بحتری، ابوتمام، بدیع الزماں الہمدانی اور ان جیسے شعرا کے اسلوب کے جامے میں پیش کیا'' (محمد صالح الجابری، الشعر التونسی المعاصر، ص ۵۲ بحوالہ رسالۃ الفکر، جولائی ۱۹۶۳ء)، ڈاکٹر البادی الغربی محمود قابادو کی شاعری کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محمود قابادو نے عام زندگی کے معاملات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور فکری مسایل اور معاملات کو بھی غور وفکر اور بحث ومطالعہ کا موضوع بنا دیا۔

محمود قابادو کے تلامذہ میں محمد بیرم الخامس، محمد السنوسی اور سالم بوحاجب کے نام نمایاں ہیں، جنہوں نے عربی زبان کو زندہ زبان کی حیثیت سے پیش کیا اور شاعری میں اپنے استاذ کی پیروی کی، عمر فروخ نے محمد الفاضل بن عاشور کی رائے نقل کرتے ہوئے ان شعرا کی شاعری کے متعلق یہ لکھا ہے ''چودہویں صدی ہجری کی ابتدا میں تونس کی شاعری پر تقلید کا غلبہ تھا سوائے چند شعرا کے جیسے شیخ سالم بوحاجب اور محمد السنوسی، انہوں نے اصلاح کے لیے نئی راہ کھولی، اس لحاظ سے ان کی شاعری موضوع کے اعتبار سے جدید اور اسلوب کے اعتبار سے قدیم تھی'' (الحرکۃ الادبیۃ والفکریۃ فی تونس، ص ۳۸، عمر فروخ، الشابی شاعر الحب والحیاۃ، ص ۷۰)۔

تونس میں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں صحافت کا آغاز ہوا، مصلحین کی جماعت نے معاشرہ کی اصلاح اور ذہنی بیداری کے لیے پہلا جریدہ ''الرائد التونسی'' ۱۸۶۰ء میں جاری کیا، محمود قابادو اور ان کے تلامذہ میں محمد السنوسی بھی اس کے مدیر رہ چکے ہیں، اس کے بعد صحافت نے آہستہ آہستہ ترقی کی اور اہل قلم علمی، ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی

موضوعات پر مضامین لکھنے لگے، خاص طور سے ۱۹۱۰ء کے بعد اخبارات میں روزانہ کے سیاسی واقعات اور سماجی مسایل کو جگہ دی گئی، اس کی وجہ سے لوگوں میں اخبارات اور رسایل میں مزید دلچسپی پیدا ہوئی اور ان کی بہ دولت تونس کے عوام میں سیاسی وسماجی شعور پیدا ہوا، ان اخبارات نے فکری اور ادبی معلومات کی طرف بھی توجہ کی اور تنقیدی مباحث کا آغاز بھی کیا، اس کی وجہ سے شعرا میں نئی فکری بیداری آئی، انہوں نے قدیم موضوعات اور تقلیدی مضامین چھوڑ کر نئے موضوعات کو اپنایا، محمود قابادو جس نے قومی اور وطنی شاعری کی بنیاد رکھی تھی، بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں شعر کے بنیادی مرکز بن گئے اور جدید شاعری کا موضوع ہی وطنی اور قومی شاعری قرار دیا گیا، محمد صالح الجابری نے تحریر کیا ''عصری شاعری وطنی اور قومی شاعری کے ہم معنی سمجھی جانے لگی ہے'' (الشعر التونسی المعاصر، ص ۸۳) جرائد اور مجلات اس نئی شاعری کو ''الشعر العصری'' (معاصر شاعری) کے عنوان کے تحت شایع کرنے لگے۔

تونس میں سیاسی اور اجتماعی مسایل اور استعماری طاقت کے ظلم و بربریت کی وجہ سے عوام میں سیاسی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی، ان کی معاشی زبوں حالی، اقتصادی اور تعلیمی پس ماندگی نے شعرا کے جذبات واحساسات کو خاص طور پر زیادہ متاثر کیا، اس لیے ان کی شاعری عوام کے دل کی آواز بن گئی اور بہت مقبول ہوئی اور اس نے عوام کے سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے میں چنگاری کا کام کیا، محمد الشاذلی کے قصاید ''الصواب اور التقدم'' جیسے جراید میں جب شائع ہوئے تو وطنیت کے جذبات پورے تونس میں شعلے کی طرح بھڑک اٹھے، ایک قصیدہ کے اشعار میں اس نے قوم کی ذہنی وفکری پستی اور زبوں حالی پر آنسو بہاتے ہوئے یہ خیالات ظاہر کیے ہیں:

''تم قوم کو کہاں تک آواز دوگے، قوم سو رہی ہے، کیا قوم میں کوئی ہے جو کسی بات کو غور سے سنے اور سمجھے، تم مت سمجھو کہ قوم مر چکی ہے، نہیں بلکہ زندہ ہے لیکن نابینا ہو چکی ہے، وہ احساس، فہم اور عقل کھو چکی ہے، اس کا کوئی ترجمان نہیں، تم کیسے ان سے سرگوشی کروگے، یہ سمجھو کہ وہ بیدار ہیں لیکن جہالت نے ان کو کہیں کا نہیں رکھا ہے، ...... میرے بھائی مجھے یہ بتاؤ ان کا علاج کیا ہے، ...... کیا جایداد فایدہ پہنچائے گی جب کہ وہ سب کچھ کھو چکی ہے''۔

ناقدین نے لکھا ہے کہ یہ مکمل قصیدہ بذات خود انقلاب تھا، اس میں شاعر نے جس درد وکرب اور حسرت کے ساتھ پرزور انداز میں قوم کے احساس وشعور کو بیدار کرنے کی جانب توجہ دلائی، اس نے شعرا وادبا کو بے چین کردیا اور ان کی شاعری سچے احساسات وجذبات کی ترجمان بن گئی، صالح السویسی کی شاعری میں بھی سماجی پس ماندگی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے اور اس کی شاعری نے بھی انقلاب کی کیفیت پیدا کردی تھی، سنجیدہ شاعری کے علاوہ ہزلیہ شاعری خاص طور سے جراید اور مجلّات میں شایع ہونے لگی اور اس صنف شاعری نے بھی استعماری طاقت کے خلاف قوم کو بیدار کیا اور یہ بھی بڑی طاقت ور شاعری تھی، اس کے علاوہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری نے بھی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کردیا، قاسم شقرون، عبدالرحمٰن الکافی، الشیخ مسرعا القیروانی، اس طرز شاعری کے نمایندہ شعرا تھے، بعض جراید ومجلّات جیسے الترقی، التقدم، الحقیقہ اور الوزیر نے مساجلۃ مسطیر، تخمیس، تسبیع کی طرف توجہ دی، منظوم نثر اور منثور نظم کو پروان چڑھایا۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان سیاسی جماعتوں کی کشمکش کا اثر صحافت اور شعر و ادب پر پڑا جب استعماری طاقت کے مظالم بہت بڑھے اور انہوں نے قومی جذبات کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی تو تونس کے عوام میں آزادی کا جذبہ اور زیادہ بھڑک اٹھا، اس کی وجہ سے نئی سیاسی صف بندی ہوئی، صحافت میں بھی دو گروہ ہوگئے، ایک طبقہ وطن کی آزادی کے لیے آواز بلند کرتا رہا جس کو دبانے کے لیے حکومت نے ہر حربہ استعمال کیا، دوسرا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو ذاتی منفعت کے لیے حکومت کا طرف دار ہوگیا تھا، ان حالات میں سارے دبے اور کچلے ہوئے لوگ آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی سماجی ومعاشی بدحالی کا حل اشتراکیت کو سمجھنے لگے، اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا، حکومت کے ظلم واستبداد کی وجہ سے شعرا قومی اور وطنی شاعری کو چھوڑ کر قدیم طرز میں مشق سخن کرنے لگے اور اسی کو اصل شاعری سمجھنے لگے، اس طرح شاعری جو نئے دور میں داخل ہورہی تھی اس سے پلٹ آئی، ابوغنیم جیسے ناقد نے اس شاعری کی مدافعت میں تنقیدی مقالات لکھے۔

لیکن تونس کے امیر الشعرا محمد الشاذلی خزندار نے جدید شاعری کی شمع کو بجھنے نہیں دیا، اس نے نہ صرف جدید شاعری کو آگے بڑھایا بلکہ اس پر تنقیدی مضامین بھی لکھے، اس نے شعر میں

ابتکار وجدت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے تحریر کیا ”شاعری شعور کی زبان اور ضمیر کی آواز ہوتی ہے، وجدان کی رہنمائی اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے“ الشاذلی خزن دار نے عصری شاعری کی معنویت کو برقرار رکھا، شیخ زین العابدین السنوسی نے الشاذلی خزن دار کے دیوان کے دوسرے حصہ کے مقدمہ میں جدید شاعری کے متعلق لکھا کہ معنوی جدت کے ساتھ شعر کی ہیئت میں بھی تبدیلی اور جدت ہونی چاہیے کہ اس لیے کہ وہ بھی ذوق ووجدان کا ایک عنصر ہے، وقت اور حالات کے ساتھ ذوق بدلتا رہتا ہے اور اس کا اثر وجدان پر بھی پڑتا ہے، جب وجدان اور احساس میں تبدیلی کے اثرات مرتب ہوتے ہیں تو اس کا اثر فکر وخیال اور زبان وتعبیر کے ساتھ ہیئت پر بھی پڑتا ہے، اس طرح زین العابدین السنوسی نے تنقیدی نقطۂ نظر سے آزاد شاعری کے لیے راہ ہموار کردی۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے سیاسی واقعات اور حکومت کے استبداد کی وجہ سے رونما ہونے والے خوں ریز حادثات کو شاذلی خزن دار کے علاوہ سعید ابوبکر، الہادی المدنی اور دوسرے شعرا نے اشعار میں جس سوز وگداز اور جذبات کی شدت کے ساتھ قلم بند کیا ہے، اسے پڑھ کر آدمی خون کے آنسو بہانے لگتا ہے، اس دور کی جدید شاعری میں جو احساس کی شدت اور وجدان کی گرمی پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل کی شاعری میں مفقود ہے، یہی احساس کی ترجمانی جدید شاعری کو قدیم طرز شاعری سے ممتاز کرتی ہے۔

سیاسی اور وطنی شاعری شاذلی خزن دار کا امتیاز ہے، محمد النخلی، شیخ الخضر التونسی نے اجتماعی اور معاشرتی مسایل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، سعید ابوبکر نے خاص طور سے تعلیمی پس ماندگی اور عورتوں کی اصلاح کا ذکر کیا، ان لوگوں سے پہلے صالح السویسی نے تونس کی اجتماعی زندگی کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر اشعار کہے، صالح السویسی کی شاعری میں قومی احساسات کی شدت کے علاوہ معاشرہ کی خرابیوں کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے، یہ مضامین چوں کہ تونس کی شاعری میں نئے تھے جو معاشرہ کے رجحانات کی عکاسی کرتے تھے، اس لیے انہوں نے تونس میں عربی شاعری کو نئی سمت دکھائی اور اسے جدید رجحان سے قریب کیا، زین العابدین السنوسی نے الادب التونسی فی القرن الرابع عشر الہجری میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

اس دور کے شعرا میں ایک اہم نام مصطفیٰ آغا کا بھی ملتا ہے، وہ خزندار کے مرتبہ کا شاعر تو نہیں ہے لیکن اس نے تونس کی عربی شاعری میں جو گراں قدر اضافہ کیا اور جو جدت پیدا کی وہ بہت اہم ہے اس کی شاعری میں جو فلسفہ و اخلاق اور اخلاقی فکر و خیال ملتا ہے وہ اس دور کے دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے، اس لیے ایک ناقد الہادی العبیدی نے کہا: خزندار کی شاعری میں وجدان اور جوش ہے جب کہ مصطفیٰ آغا کی شاعری میں وجدان کے ساتھ ہی فکر و خیال اور تعقل بھی شامل ہے، اس کی وہ شاعری جس میں فلسفۂ زندگی اور انسانی اخلاق و اقدار کی ترجمانی کی گئی ہے اس میں فکری گہرائی اور وسعت ہے، اس کے ساتھ ہی اس کی شاعری کا بڑا حصہ نظم گوئی پر مشتمل ہے اور اس کی نظموں (اقاصیص منظومۃ) کا بنیادی موضوع اصلاح معاشرہ ہے، شاعری کی اس خصوصیت کی وجہ سے مصطفیٰ آغا دوسروں سے ممتاز ہے، زبان و بیان اور اسلوب میں اس نے عصر اموی اور عصر عباسی کے شعرا کی پیروی کی ہے، اسی وجہ سے وہ عمید الشعرا کہلایا، الطاہر الحداد بھی ان شعرا میں تھے جنھوں نے سیاسی اور قومی موضوع پر شاعری کی جو فکر و فن کے اعتبار سے بہتر گراں قدر تھی۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اخیر تک شعرا کے افکار و خیالات میں صحافت، تعلیم اور فرانسیسی شاعری کے ترجمے اور مطالعہ نے بڑی وسعت پیدا کر دی تھی اور ان کا سیاسی شعور بھی بیدار ہو گیا تھا، دینی تحریکات نے بھی جو استعماری طاقت کی سخت مخالف تھیں عربی شاعری کو متاثر کیا، اسلامی فکر اور دینی جذبہ کے حامل شعرا نے دینی افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، اسلامی فکر و خیال کے ترجمان شاعر و ادیب جامع الزیتونہ کے رہین منت اور فیض یافتہ تھے جو افریقہ کی پہلی اور اہم یونیورسٹی اور تعلیم کا منبع اور سرچشمہ تھی، اس نے دینی تعلیم اور تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے میں بڑا حصہ لیا، دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی دینی تعلیم کا غلبہ تھا، ان کے تعلیم یافتہ بھی دینی تعلیم و ثقافت کے پروردہ تھے، چنانچہ شعرا کی بڑی تعداد دینی افکار کو ہی سیاسی اور سماجی اصلاح کا حل سمجھتی تھی، ان شعرا میں رمضان محمود بن سلیمان، علی النیفر، محمد صالح النیفر، ابو عبداللہ محمد العزیز، ابوالنجیہ مصطفیٰ رضوان اور ابوالحسن بن شعبان کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں فرانسیسی شاعری کے جو ترجمے عربی میں ہوئے ان سے بھی تونس کے شعرا

نے استفادہ کیا لیکن براہ راست فرانسیسی زبان کی شاعری کا مطالعہ کرنے والے شعرا کم ہیں تاہم فرانسیسی شاعری کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مطالعہ کا اثر تونس کی عربی شاعری پر بھی پڑا، خاص طور سے نوجوان شعرا فرانسیسی رومانوی شاعری سے متاثر ہوئے لیکن تونس کی رومانوی شاعری فرانسیسی رومانوی شاعری سے قدرے مختلف تھی، اس دور میں فرانسیسی شاعری کے مطالعہ کی وجہ سے شعرا میں دوسرے نئے رجحانات بھی پیدا ہوئے۔

سیاسی اور اجتماعی حالات کی وجہ سے تونس کے شعرا کی رومانوی شاعری میں واقعیت، رمزیت اور تصوف کے عناصر بھی شامل ہو گئے تھے، پھر بھی تونس کی عربی شاعری میں رومانوی شاعری اچھی طرح ابھری اور تونس کے شعرا نے اس صنف شاعری کے ذریعہ عالم عرب کے صف اول کے شعرا میں اپنا مقام بنایا۔

اس دور کی شاعری میں اشتراکی اثرات بھی کارفرما ہے، معاشی زبوں حالی کی وجہ سے عوام اور شعرا دونوں نے اشتراکی نظریہ میں راحت جاں تلاش کرنے کی کوشش کی، فرانسیسی شعرا کے مطالعہ سے جدید عربی شاعری میں رمزیت کا رجحان بھی عام ہوا اور شعرا نے استبداد کے خلاف رمزیت کے پیرائے میں اپنے فکر و خیال اور جذبات و احساسات کو پیش کیا اور اس صنف شاعری نے بھی تونس میں ترقی کی۔

جن شعرا نے رومانوی شاعری میں سب سے زیادہ اپنے شاعرانہ جوہر دکھائے ان میں سرفہرست ابوالقاسم الشابی کا نام ملتا ہے، رومانوی شعرا میں پورے مغرب میں ابوالقاسم الشابی سے زیادہ شہرت کسی کو نہیں ملی، اس کی شاعری میں زندگی کی حرارت، جذبہ کی شدت اور احساسات کا تلاطم جس طرح پایا جاتا ہے وہ کم ہی کسی عربی شاعر کے یہاں ملے گا، الشابی کو ''شاعر الحب و الحیاۃ'' کہا گیا ہے، مشرق و مغرب میں اس پر درجنوں تحقیقی کتابیں لکھی گئی ہیں، اس کی زندگی میں جو درد و غم تھا اس درد و غم کے احساس نے اس کی شاعری میں ایسی روح پیدا کر دی جو عربی شاعری کے باقی رہنے تک باقی رہے گی، خلیفہ محمد التلیسی نے کہا ''الشابی ایک صاحب فن شاعر ہے، اس کی وجہ سے اس دور کے تمام شعرا میں وہ ممتاز ہے اس کی شاعری میں موسیقی کی دل آویزی، آرٹسٹ کا آرٹ اور ایک عظیم شاعر کا حسن بیان شامل ہے''۔ (الشابی و جبران)

رومانوی شعرا میں جو شاعرانہ چشمک تھی اور "الشالوث الرومانی" کے عنوان سے جو شعرا تونس کی سرزمین میں مشہور ہوئے ان میں شابی کے علاوہ محمد الحلیوی اور محمد البشروش کا نام بھی لیا جاتا ہے، محمد البشروش کی رومانیت میں واقعیت کی خصوصیت پوشیدہ ہے، اس لیے کہ اس نے غمِ زمانہ کو غمِ جاناں اور کمزوروں کے غم کو اپنا غم بنالیا تھا، البتہ محمد الحلیوی کی رومانیت میں فرانسیسی شاعری کا اثر ہے جس میں انقلابی کیفیت کا رجحان غالب ہے، ان کے علاوہ ابن تومرت کی شاعری میں بھی کچھ نہ کچھ رومانیت کا اثر موجود ہے، دراصل وہ نثر نگار تھے اور کہانیاں لکھتے تھے مگر شعر بھی کہے ہیں جن میں معاشرہ کی زبوں حالی کا ذکر اور کمزوروں کا درد وغم بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جدید عربی ادب وشاعری کی تاریخ میں عظمت وشہرت کی بلندی پر پہنچا ہوا ایک نام محمود بیرم التونسی کا بھی ملتا ہے، اس کا خاندان تونس کا ہے لیکن محمود کی پیدائش اسکندریہ میں ہوئی، رجاء نقاش نے اس کی شاعری اور فنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "اس نے ہزاروں قصیدے، مقامات، ڈرامے اور مختلف تمثیلات اپنے پیچھے چھوڑے، اس کی شاعری کبھی خشک نہ ہونے والے صاف شفاف شیریں پانی کے چشمے کی طرح ہے" (مقدمہ کتاب وصفحات ضائعۃ من حیاۃ بیرم التونسی) دوسرے ناقدین نے بھی بیرم التونسی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور تونس کے شعرا میں اس کو شمار کیا ہے حالاں کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ مصر میں گذرا۔

عبدالرزاق کرباکۃ (۱۹۰۱-۱۹۴۵) کی شاعری کا موضوع اجتماعی زندگی ہے لیکن اس کی جس شاعری میں رومانیت کا عنصر غالب ہے وہ زیادہ بہتر ہے، عمر فروخ نے کہا "وہ ایک وجدانی شاعر کی حیثیت سے پروان چڑھا" (شاعر الحب والحیاۃ، ص ۸۰) اور ابوالقاسم محمد کرو نے کہا "اس کی شاعری زندگی سے آراستہ اور پیراستہ ہے" (عبدالرزاق کرباکۃ شاعر الغناء والمسرح) اور محمد الفاضل بن عاشور نے کہا "باوجودنے کہ اس کی شاعری کی روح اس کی غزل میں ہے لیکن اس کا فن برائے فن ہے" (الحرکۃ الادبیۃ والفکریۃ، ص ۱۹۶)۔

رومانوی شعرا کی صف میں ایک نام مصطفیٰ خریف (۱۹۰۹-۱۹۶۷) کا بھی لیا جاتا ہے، اس نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا رومانوی شاعری سے کی، خود الشابی نے مصطفیٰ خریف کی رومانوی شاعری کی تعریف کی ہے لیکن اس نے اخلاقی موضوعات پر بھی شاعری کی ہے، اسی

لیے ابوالقاسم محمد کرو نے کہا "نیکی اور محبت ہی وہ فکری اور روحانی سرچشمہ ہے جس سے اس کی شاعری نے کسب فیض کیا ہے اور اسی سے اس نے اپنی شاعری کی زلف سنواری ہے"۔

انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے قبل ہی شعر کی ہیئت میں تبدیلی شروع ہوچکی تھی، شعرا نے شعر مرسل اور شعر حر (آزاد شاعری) پر طبع آزمائی کا آغاز کردیا تھا، زین العابدین السنوسی نے وقت کے ساتھ ہی جذبات واحساسات اور شعر کی ہیئت میں بھی تبدیلی کو فن کے لیے ضروری قرار دیا اور اس طرح شعرا کی بڑی تعداد نے آزاد شاعری میں طبع آزمائی کی اور اس فن کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد شعرا جدید کلاسیکی، غنائی، واقعیت (اشتراکی) اور دوسرے رجحانات کو اپنی اپنی فکر، ذوق اور طبیعت کے مطابق شعر میں ڈھالتے رہے۔

تونس ۱۹۵۹ء میں آزاد ہوا، اس کی آزادی سے قبل قومیت، وطنیت اور معاشرتی وسماجی مسایل شاعری کے موضوع میں شامل رہے اور جن شعرا نے اپنے اظہار کے لیے کلاسیکی شاعری کے اسلوب کو اپنایا اور عمود شعری کی پابندی ضروری طور پر کیا، ان میں مصطفیٰ خریف، محمد المرزوقی، الشاذلی عطاء اللہ، الہادی نعمان، عبدالمجید بنجدو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، احمد اللغمانی کی شاعری میں قومی مسایل اور وطن کی آزادی کا تصور خاص طور پر پایا جاتا ہے، لیکن اس کے تجربے ہیئت میں ہیں، احمد المختار الوزیر کی شاعری احمد اللغمانی کی شاعری سے قریب تر ہے۔

جب آزادی کے بعد کی شاعری کا موضوع حصول آزادی نہیں رہا تو اکثر شعرا نے رومانوی اور غنائی شاعری کو ترجیح دیا لیکن ان کی اور آزادی سے پہلے کی رومانوی شاعری کے رنگ و آہنگ میں فرق ہے، آزادی کے بعد کی رومانوی شاعری خالص داخلی احساسات کی ترجمان ہے، اس میں تجربات کی جدت بھی پائی جاتی ہے، نورالدین صمود، جمال حمدی، زبیدہ بشیر، جعفر ماجد، محی الدین خریف، محمد العروس، عبدالرحمن عمار اور علی شلفوح اس طرز شاعری کے نمایندہ شعرا ہیں۔

فرانسیسی آمرانہ حکومت نے تونس کو دانستہ معاشی طور پر کمزور کرکے اس کی تہذیب و ثقافت کو مٹانے کی کوشش کی اور طبقہ واریت کو ہوا دی، مظلوم اور پس ماندہ طبقے کو اس کا احساس ہوا تو اس نے سماجی مساوات اور عدل وانصاف کے حصول اور معاشی اصلاح کے لیے اشتراکی نظریے کو اختیار کرلیا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دینی تحریکوں اور جماعتوں نے اسلامی نظریات وافکار کو

اس قوت کے ساتھ نہیں پیش کیا، جس زور وقوت سے اشتراکی افکار پیش کیے جارہے تھے اس لیے جدید تعلیم یافتہ افراد اشتراکی نظریات سے متاثر ہوئے اور شعرا بھی معاشرہ کے حالات اور عوام کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر اپنی شاعری میں اشتراکی نظریات اور افکار وخیالات کی ترجمانی کرنے لگے، اشتراکیت کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے والے شعرا میں عمر السعیدی الغربی، مصطفی الحبیب بحری، احمد القدیری، منور صمادح اور المیدانی بن صالح کے نام نمایاں ہیں، ان کی شاعری صرف اشتراکی افکار ونظریات کی حامل نہیں ہے بلکہ انہوں نے دوسرے موضوعات کو بھی ہاتھ لگایا اور غزل اور دوسرے اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

حقایق کا اظہار تونس کی جدید شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے، اس کا سبب وہاں ہونے والے مظالم اور پس ماندگی ہے "قابادو" سے لے کر المیدانی تک تمام ہی شعرا کی شاعری اسی سے متاثر ہے اور نئے عہد کی صدائے بازگشت ہے، ڈاکٹر طاہر احمد مکی تونس کے شعرا کی زبوں حالی پر طنزیہ انداز میں یوں رقم طراز ہیں:۔

> "ان کی شاعری میں رونے دھونے کے علاوہ کچھ بھی نہیں، کوئی بھی شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس میں دل گرفتگی اور ویرانی کا ہی ذکر ہوتا ہے اور زندگی کی ہر چیز میں بدشگونی پائی جاتی ہے گویا کہ دنیا حسن وجمال سے خالی ہے"۔

طاہر احمد مکی کے تبصرہ سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مشرقی ناقدوں نے کس زاویۂ نگاہ سے تونس کی شاعری کا جایزہ لیا، اس کی وجہ سے تونس کی جدید عربی شاعری کو وہ درجہ نہیں ملا، جس کی وہ مستحق تھی، حالاں کہ تونس کی جدید عربی شاعری اپنے افکار وخیالات، معانی کی جدت وندرت اور زبان وبیان کی رعنائی کی وجہ سے مشرق کی ہم سری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

الجزائر

الجزائر کی سرزمین میں عربی شاعری بنی زیان اور بنی عبدالوادی (۱۳۳۷-۱۵۰۴) کے دور حکومت میں وجود میں آئی اور دو صدی سے زیادہ مدت تک اس کا چرچا رہا، کچھ عرصہ تک یہاں کی شاعری قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی، حکمران وقت امیر ابوحمو موسیٰ (۷۲۷-۷۹۱ھ) ممتاز شاعر تھا، اس کی اور کے دور کی شاعری نے اعلیٰ معیار قایم کیا اور الجزائر کی ادبی وثقافتی ترقی میں نمایاں

حصہ لیا، امیر ابوحمو موسیٰ کی شاعری میں دینی عنصر غالب ہے، قصیدے خاص طور سے نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی تقریبات کی مناسبت سے کہے ہیں جن میں جدت وندرت ہے، ابن خلدون یحییٰ وعبید الرحمن اور التنسی (متوفی ۶۸۰ھ) اور ابن مریم کی تحریروں میں امیر کے دور کے اشعار کثرت سے منقول ہیں، الغبرینی نے الدرایۃ میں اور ابن عمار نے اپنی کتاب "اللواء النصرفی فضلاء العصر" میں سولہویں صدی عیسوی تک کے شعرا کے حالات تفصیل سے تحریر کیے ہیں، اس کے بعد عثمانی دور کی شاعری شروع ہوئی، اس دور میں جزائر کے شعرا کی شاعری دوسرے عرب ممالک کے شعرا کی شاعری سے مختلف نہیں ہے، الفاظ کی بازی گری، صنعت لفظی کے ساتھ تشطیر اور تخمیس اور اس طرح کی فنی صناعی کو ہی شاعری کا کمال سمجھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی شاعری کی اصل روح جاتی رہی، عثمانی حکومت کے انحطاط کے بعد فرانس کی استعماری حکومت نے عربی شاعری ہی نہیں بلکہ عربی زبان اور ثقافت کا جنازہ الجزائر سے نکال دیا، عربی زبان اور عربی شاعری کا چلن صرف دینی حلقوں تک محدود ہوگیا اور جاہلانہ تصوف ہی شاعری کا اصل موضوع بن گیا، اس دور میں استعماری طاقت نے ظلم وزیادتی کا جو بازار گرم کررکھا تھا، اس کی وجہ سے بھی شعرا اور عوام کو تصوف اور ترک دنیا میں راحت واطمینان محسوس ہوا اور انہوں نے گوشہ نشینی ہی میں عافیت سمجھی، اس لیے صوفیانہ شاعری ہی افکار وخیالات اور زبان وبیان کی تمام خرابیوں کے ساتھ باقی رہ گئی کیوں کہ استعماری طاقت کے جبر وقہر کی بنا پر ظلم وزیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا ممکن ہی نہیں تھا البتہ بعض شعرا نے صوفیانہ شاعری کے رنگ میں تلمیحات کے پیرایے میں ظلم وزیادتی کے خلاف اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا، اس کے برخلاف شعرا کے ایک طبقہ نے مدحیہ شاعری کو موضوع سخن بنایا، جس کی روایت عربی زبان میں قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے، ان شعرا نے بھی ارباب اقتدار کی مدح سرائی کو اپنا وطیرہ بنایا اور داد ودہش کے بغیر مفت میں استعماری قوت اور حکمرانوں کی تعریف کے پل باندھے، ظاہر ہے اس طرح کی شاعری اصلیت اور شاعری کی بنیادی روح سے خالی ہوتی تھی، عاشور بن عمر کے دیوان کے اس نام منار الاشراف علی فضل عصاۃ الاشراف و موالیھم من الاطراف (شرفا اور اس کے حوالی وموالی کی تعریف کے روشن مینار) ہی سے اس کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ استعماری طاقت کی خوشامد اور

خوش نودی کے لیے شعرانے کس طرح کے مدحیہ قصاید کہے ہوں گے، واشور کا یہ دیوان ۱۹۱۴ء میں شایع ہوکر منظر عام پر آیا، اس کے علاوہ حفناوی نے جو فرانسیسی حکمرانوں کی تعریف میں قصیدے کہے ہیں، ان کے ایک قصیدہ کے چند اشعار کے ترجے اس طرح ہیں:

☆ ہر ایک نسل (قوم) میں اچھے اور بہتر لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا علم وفن کی تاریخ میں ذکر آتا ہے۔

☆ اہل یونان نے علم کے میدان میں اپنا اہم مقام بنایا اور اس کے بعد عربوں نے اس میدان میں اپنے کارنامے چھوڑے۔

☆ ہر شخص جس نے علم کے میدان میں قابل تعریف کارنامے چھوڑے ان کا علم ایسا ہے جس کی بلندی پر آگ روشن ہے۔

☆ انہوں نے عوام کی حکومت قایم کی اور ہر علم کے اپنے دور میں کارنامے ہوتے ہیں۔

☆ ثعلبیہ میں علم کی نشانی اور علامت روشن اور نمایاں ہے یہ کیا ہی بہتر نام اور پڑوسی ہے۔

☆ عظمت کی نشانی قایم کی گئی ہے اور اس کی ایک تاریخ ہماری قوم سے وابستہ ہے اور اسی کے لیے وجود میں آئی اور حاکم وقت "جونار" اپنے وقت کے تابندہ ستارہ ہیں۔

تلسمان کے قاضی شعیب بن علی، حنفیہ کے قاضی ابوبکر ابوطالب اور ابوالقاسم الحفناوی نے اسی انداز کے شعر کہے (الحفناوی نے "تعریف الخلف برجال السلف" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دیا جس میں الجزائر کی قدیم وجدید شخصیات کا تعارف کرایا ہے)، اس سے ظاہر ہے کہ عربی شاعری بیسویں صدی کی ابتدا میں ابتذال کے دور سے گذر رہی تھی، اس دور کے شعرا میں مفتی محمود اور محمد بن عبد الرحمٰن الدیسی کی شاعری کسی قدر نمایاں حیثیت رکھتی ہے، ان کی شاعری میں وزن تو پایا جاتا ہے لیکن اس میں شعر کی اور کوئی خوبی موجود نہیں ہے، عربی زبان و تہذیب کو مٹانے، فرانسیسی زبان کو رواج دینے اور مغربی تعلیم وثقافت کو عام کرنے کی وجہ سے تعلیم یافتہ افراد نے فرانسیسی زبان ہی میں لکھنا شروع کیا، اس کی وجہ سے عربی زبان انحطاط کا شکار ہوگئی اور فصیح عربی زبان بولنے اور لکھنے والے کم سے کم تر ہوگئے، عربی زبان کی تعلیم خانقاہوں اور دور دراز علاقوں کے دینی مدرسوں کے علاوہ ہر جگہ مفقود ہونے لگی۔ (باقی)

"کنز الرموز"

از ڈاکٹر محمد معتصم عباسی آزاد☆

"کنز الرموز" سہروردیہ سلسلے کے مشہور صوفی شاعر امیر حسینی کی عارفانہ مثنوی ہے، جس میں سہروردیہ سلسلے کے عقاید ونظریات کے مطابق تصوف کے رموز ونکات اور اس کے مقامات کی تشریح کی گئی ہے، یہ مثنوی آٹھویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے ادبیات تصوف میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس کی مقبولیت کا اندازہ برصغیر ہند وپاک میں پائے جانے والے اس کے ناقص مخطوطوں کی کثرت سے کیا جاسکتا ہے، جن میں اشعار کی تعداد، ان کی ترتیب اور عنوانات کی تشکیل میں اختلاف کے ساتھ کتابت کی بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے حسینی کے "سن پیدایش"، "سن وفات" اور ان کے شیخ کے تعین میں تذکرہ نگاروں سے فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، جدید مورخین اور محققین نے انہیں تذکرہ نگاروں کے بیانات پر انحصار کیا ہے، چوں کہ حسینی کی دیگر تصانیف کی طرح "کنز الرموز" میں سن تصنیف نہیں دیا گیا ہے، لہذا اس کا شمار ہندوستانی ادبیات تصوف میں نہیں کیا جاتا جب کہ داخلی شہادتیں "نزہت الارواح" کی طرح "کنز الرموز" کے بھی ملتان میں لکھے جانے کی تصدیق کرتی ہیں، اس مضمون میں انہیں داخلی شہادتوں کی بنیاد پر تذکرہ نگاروں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور "کنز الرموز" کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حسینی کا اصل نام تذکروں میں حسینی کے اصل نام کے بارے میں اختلاف ہے، فرشتہ نے امیر حسن بن نجم الدین لکھا ہے، (۱) "سیر العارفین" کے مصنف نے شیخ صدر الدین بن نجم الدین المعروف بہ سید حسن بتایا ہے، (۲) اودھ لائبریری کے کیٹلاگ اسپرنگر نے امیر کبیر الدین حسین بن عالم بن ابوالحسن الحسینی لکھا ہے، (۳) جدید مورخین ومحققین شیخ رکن الدین حسین بن عالم تسلیم کرتے

☆ جی ۔ ۳/ ۷ سفینہ اپارٹمنٹ، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ۔

ہیں، (۴) خود حسینی ''نزہت الارواح'' میں اپنے کو حسین بن عالم بن ابوالحسن الحسینی لکھتے ہیں۔ (۵)

''.....چنیں گوید مصنف ایں بدائع ولطائف ومولف ایں غرائب وظرایف فقیر حقیر حسین بن عالم بن ابی الحسن الحسینی''۔

چوں کہ ان کے مرشد کا نام بھی رکن الدین تھا لہذا عین ممکن ہے کہ احتراماً وہ اپنا نام رکن الدین لکھنے سے گریز کرتے رہے ہوں، بہرحال وہ امیر حسینی کے نام اور ''فخر سادات'' اور ''سید سادات'' کے القاب سے مشہور تھے۔

سن پیدائش

سن پیدائش کا ذکر تذکروں میں نہیں ہے لیکن ''نزہت الارواح'' جو حسینی کی نثری تصنیف ہے، اس سے سن پیدائش کے تعین میں مدد ملتی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ (۶)

''.....ای شب بدروز سال عمرت بہ چہل رسیدہ وتو از چہل خود ہم چناں نارسیدہ، بنگر کہ سرت راہمہ شیب وفراز گرفت وپایت ہنوز شیب وفراز نگرفت''۔

''نزہت الارواح'' کا سن تصنیف ۷۱۱ ہجری ہے جیسا کہ حسینی خود لکھتے ہیں۔ (۷)

''در شہور سنہ احدی وعشر وسبع مأۃ مشاطہ نشاط فکر بر بساط انبساط گوش و گردن ہر یکی را بہ زیور فصاحت و بلاغت مفرط وموشح ساخت واز سواد وخلخال ترصیع وترجیع ساعد وساق شان مزین ومحلی گردانیدہ''۔

اس حساب سے سن ۶۷۱ ہجری ان کا قطعی سن پیدائش ہے، وہ غور کے مقام گردیو میں پیدا ہوئے تھے۔

والد کا نام وپیشہ

ان کے والد کا نام تذکروں میں نجم الدین لکھا ہے لیکن خود حسینی نے ''نزہت الارواح'' میں صرف عالم لکھا ہے، وہ سید عالم کے نام سے مشہور تھے، ان کا شمار اس دور کے افاضل میں ہوتا تھا، تصوف کی طرف ان کا ذہنی میلان تھا جیسا کہ ''زاد المسافرین'' میں حسینی کے اس بیان سے مستنبط ہوتا ہے۔ (۸)

روزی پدر ایں حکایتم کرد   کہ جمع محققان یکی مرد
از درد فراق خود بر آشفت   در حالت شکر با خدا گفت

آخر بچہ جرم دورم از تو   کای دل و دیدہ نورم از تو
ایں زیستنت گناہ بس نیست   گفتند توئی حجاب کس نیست
ایں جا گنہ کبیرہ ایں است   ہی ہی بخدا کہ ہم چنیں است
ویں قصہ کسی شنیدہ ہرگز   ایں طرفہ کسی ندیدہ ہرگز
آسودہ کسی کہ ہست غافل   دیوانہ شود ہزار عاقل

وہ پیشہ کے اعتبار سے تاجر تھے، اس سلسلہ میں ملتان ان کا آنا جانا رہتا تھا، قرائن اس قیاس کی تائید کرتے ہیں، وہ شیخ بہاؤالدین زکریا (م-۶۶۶ھ) کے مرید تھے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

تعلیم

حسینی کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں، گمان اغلب یہ ہے کہ انہیں ابتدائی تعلیم ان کے والد نے دی تھی، انہیں کے زیر تربیت وہ پروان چڑھے، ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفہ وحکمت، تصوف اور شعروادب میں انہیں کامل دست گاہ تھی، سلوک ومعرفت کی منزلیں جیسا کہ آگے آئے گا شیخ بہاؤالدین زکریا کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح کی خدمت میں رہ کر طے کی تھیں۔

حسینی ملتان کب آئے

حسینی ملتان کب اور کس طرح پہنچے، اس سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے عجیب وغریب حکایتیں وضع کی ہیں، جنہیں نظرانداز کرتے ہوئے ہم ''سیرالعارفین'' کے مصنف شیخ جمالی کے بیان پر انحصار کرتے ہیں (۹) جو حقیقت سے زیادہ قریب ہے، جمالی کا بیان ہے کہ حسینی ملتان دوبار آئے تھے، پہلی بار اپنے والد کے ہم راہ شیخ بہاؤالدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، شیخ بہاؤالدین زکریا کے سن وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے، ''مرآۃ الاسرار'' میں ۵۶۵ھ، ''راحت القلوب'' میں ۶۵۶ھ، ''اخبار الاخیار'' میں ۶۶۱ھ، ''سفینۃ الاولیا'' میں ۶۶۶ھ اور ''سیر الاولیا'' میں ۶۶۷ھ درج ہے، اگر جمالی کی روایت کو درست تسلیم کرلیا جائے تو شیخ بہاؤالدین زکریا کا سن وفات ''اخبار الاخیار'' کے بیان کے مطابق ۶۶۱ھ تسلیم کرنا پڑے گا، اس وقت حسینی کی عمر نو دس سال کی تھی اور ان کے والد حصول برکت کے لیے انہیں شیخ کی خدمت میں لائے ہوں گے، اس کی تائید ان کی مدح میں حسینی کے

کہے ہوئے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔

من کہ رو از نیک و از بد تافتم — ایں سعادت از قبولش یافتم

بصورت دیگر حسینی کی پیدائش سے قبل ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

دوسری بار وہ والد کے انتقال کے بعد علایق دنیوی سے دست کش ہو کر ۶۸۸ھ کے آس پاس ملتان پہنچے ہوں گے، اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی، جلال الدین خلجی کی مدح میں کہے ہوئے ان کے قصیدے سے اس امر کی تائید ہوتی ہے، جلال الدین خلجی (م-۶۹۵ھ) ۶۸۸ھ میں دلی کے تخت پر قابض ہوا تھا، حسینی اس کی مدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔(۱۰)

آغاز صبح است ای پسر پر کن بمن دہ جام را — خرقہ بروں افگن ز تن ایں رند صوفی نام را

دارندۂ تخت و کلہ سلطان دیں فیروز شد — آں سروری کز مہر و مہ برتر زند اعلام را

اس وقت بہاؤ الدین زکریا کا انتقال ہو چکا تھا، ان کے صاحب زادے شیخ صدر الدین عارف ضعیفی اور بیماری کے باعث عزلت نشیں ہو چکے تھے، مسند رشد و ہدایت پر ان کے صاحب زادے شیخ رکن الدین ابوالفتح متمکن تھے، معاصر مورخ ضیاء الدین برنی بھی شیخ رکن الدین کو خلجی عہد کے مشائخ میں شمار کرتے ہیں۔(۱۱)

حسینی کے مرشد حسینی کا صحیح سن پیدایش معلوم نہ ہونے کے باعث تذکرہ نگاروں نے ان کے مرشد کے تعین میں بھی فاش غلطی کی ہے، دولت شاہ سمرقندی انہیں شیخ شہاب الدین سہروردی (م-۶۳۲ھ) کا مرید بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میر حسینی ہروی اور فخر الدین عراقی کرمان میں اوحد الدین کرمانی (م-۶۳۵ھ) کی خانقاہ میں پہنچے اور چالیس روز قیام کیا، حسینی نے ''زاد المسافرین'' عراقی نے ''لمعات'' اور اوحد الدین کرمانی نے ''ترجیع بند'' لکھی اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں پیش کیا، (۱۲) حالاں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی اور اوحد الدین کرمانی، حسینی کی پیدایش سے قبل فوت ہو چکے تھے، ''زاد المسافرین'' ۷۲۹ھ کی تصنیف ہے اور عراقی نے ''لمعات'' قونیہ میں لکھی تھی۔

زیادہ تر مورخین اور محققین نے شیخ بہاؤ الدین زکریا (م-۶۶۱ھ) کو ان کا مرشد تسلیم کیا ہے، (۱۳) لیکن جیسا کہ داخلی شہادتوں سے ثابت ہے، حسینی کے دوبارہ ملتان پہنچنے سے قبل

شیخ بہاؤ الدین زکریا بھی انتقال فرما چکے تھے، حسینی کی باطنی تربیت درحقیقت ان کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح نے کی تھی، جن کی مدح ''کنز الرموز'' میں موجود ہے۔

وفات حسینی کی وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے، ''نفحات الانس'' میں ۷۱۸ھ دیا ہوا ہے، (۱۴) ''مجالس العشاق'' اور ''ریاض الشعرا'' نے بھی اسی کو نقل کیا ہے، دولت شاہ سمرقندی نے ۷۱۹ھ (۱۵) اور رضا قلی خاں نے ۷۱۷ھ لکھا ہے، (۱۶) جدید افغانی ادیب مائل ہروی کا بیان ہے کہ ان کی قبر پر جو قطعہ وفات کندہ ہے اس میں ۷۱۸ھ لکھا گیا ہے (۱۷) لیکن حسینی کی تصنیف ''زاد المسافرین'' کا سن تصنیف ۷۲۹ھ ہے۔(۱۸)

''در ہفت صد و بست و نہ زہجرت گشت آخر ایں کتاب ختم''۔

لہذا حسینی کا انتقال ۷۲۹ھ کے بعد ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے پیر و مرید کے نام کی یکسانیت کے باعث تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے شیخ رکن الدین ابوالفتح کے سن وفات کو حسینی کا سن وفات سمجھ لیا، جامی کے دیے ہوئے سن وفات کو بعد میں ان کی قبر کے کتبہ پر کندہ کرا دیا گیا۔

جدید ایرانی نقاد و ادیب ڈاکٹر فروغ حکمت حسینی کا سن وفات ۷۴۱ھ بتاتے ہیں، (۱۹) یہی زیادہ قرین قیاس ہے کیوں کہ اس وقت حسینی کی عمر ستر برس کی ہوتی ہے۔

ملتان میں حسینی کا قیام کتنے عرصہ رہا اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا لیکن ۷۱۷ھ میں وہ ہمیں خراسان میں نظر آتے ہیں، ''گلشن راز'' میں محمود شبستری لکھتے ہیں۔(۲۰)

گذشتہ ہفتدہ با ہفت صد سال — ز ہجرت ناگہاں در شہر شوال

رسولی با ہزاراں لطف و احساں — رسید از خدمت اہل خراساں

بزرگی کندراں جا ہست مشہور — باقسام ہنر چوں چشمۂ نور

ہمہ اہل خراساں از کہ و مہ — دراں عصر از ہمہ گفتند بہ

جہان جاں و تن از نور عینی — امام سالکان سید حسینی

نوشتہ نامہ ہا در باب معنی — فرستادہ بر ارباب معانی

اس وقت خراسان کا حاکم سلطان غیاث الدین کرت (م-۷۲۹ھ) تھا، اس کی مدح

میں حسینی کے قصیدے سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ ۷۱۷ھ میں خراسان چلے گئے تھے، (۲۱) اگر ۷۱۷ھ شیخ رکن الدین ابوالفتح کا سن وفات مان لیا جائے تو گویا انتیس سال کا طویل عرصہ حسینی نے اپنے شیخ کی خدمت میں ملتان میں گذارا تھا، انہوں نے چھیالیس سال کی عمر میں ملتان چھوڑا، ہوگا، ستر سال کی عمر میں وفات پائی اور ہرات میں مدفون ہوئے۔

تصانیف انہوں نے منظوم و منثور کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔
۱-"کنزالرموز"، ۲-"نزہت الارواح"، ۳-"طرب المجالس"، ۴-"روح الارواح"، ۵-"پانزدہ سوال میر حسینی" از شیخ محمود شبستری، ۶-"عنقای مغرب"، ۷-"پنج گنج"، ۸-"صراط مستقیم"، ۹-"قلندر نامہ"، ۱۰-"زادالمسافرین"، ۱۱-"دیوان امیر حسینی"- "سی نامہ" یا "عشق نامہ" ان سے غلط منسوب ہے، یہ مثنوی سید حسن غزنوی الحسینی کی ہے۔

کنزالرموز ان میں سے صرف دو تصانیف "کنزالرموز" اور "نزہت الارواح" کے بارے میں پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں تصنیف ہوئی ہیں، "نزہت الارواح" کا تعارف بہت پہلے کراچکا ہوں، (۲۲) اس مضمون میں "کنزالرموز" کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس تعارف کا مقصد اہل علم اور محققین کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانا ہے، تصوف کے عملی اور نظری فلسفہ، اس کے رموز و علائم اور مصطلحات و مقامات سے میری واقفیت انتہائی محدود ہے، اس لیے اشعار کے ترجموں میں غلطیوں کا ہونا خارج از امکان نہیں ہے، مثنوی کا کوئی سائنٹفک اڈیشن میرے علم کی حد تک شائع نہیں ہوا ہے اور نہ اس پر کوئی تفصیلی مضمون نظر سے گذرا ہے، میں نے جس مخطوطے سے استفادہ کیا ہے وہ مثنوی کا انتخاب ہے، اس میں ایسے اشعار بھی حذف کردیے گئے ہیں جن کا تعلق ربط و تسلسل سے ہے جس کی وجہ سے معنی و مفہوم کو سمجھنے میں کافی دقت پیش آتی ہے، کتابت کی بھی کافی غلطیاں ہیں، تصوف سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم اس تعارف کے بعد اگر تھوڑی سی بھی توجہ دیں گے تو اس دقت کو دور کرکے اس مثنوی کا مجھ سے بہتر تعارف پیش کرسکتے ہیں، نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہوتا ہے۔

"کنزالرموز" امیر حسینی کی عارفانہ مثنوی ہے جو رمل مسدس محذوف میں مثنوی "مولوی

معنوی" کے وزن پر لکھی گئی ہے، اس کے مختلف مخطوطوں میں اشعار کی تعداد مختلف ہے، مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں اس کے دو مخطوطے ہیں، ایک ذخیرہ "سبحان اللہ" میں ہے جو کسی مظفر جنگ کی ملک تھا، اس کی مہر پر ۷۴۹ھ ثبت ہے، (۲۳) اس میں اشعار کی تعداد پانچ سو نوے ہے، دوسرا مثنوی کا انتخاب ہے جو یونیورسٹی کے ذخیرے میں ہے اور ۱۳۰۹ھ میں بہلول خاں کا کتابت کیا ہوا ہے، (۲۴) اس میں اشعار کی تعداد چار سو انتیس ہے، افغانی ادیب مائل ہروی نے اپنے کتابچہ "شرح حال و آثار امیر حسینی غوری ہروی" میں جس مخطوطے کا ذکر کیا ہے، اس کے اشعار کی تعداد پانچ سو بہتر ہے، (۲۵) مصحح "آتش کدہ" کل تعداد نو سو بائیس بتاتے ہیں، (۲۶) یہ مثنوی حیدرآباد اور طہران سے شائع ہوچکی ہے، (۲۷) لیکن کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکی جس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ یہ بھی مکمل ہے یا ناقص ہے۔

مثنوی کے جس قلمی "انتخاب" سے استفادہ کیا گیا ہے اس میں ہر موضوع پر عنوانات قائم کیے گئے ہیں لیکن مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے اور ذخیرۂ "سبحان اللہ" کے مخطوطے سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے کہ یہ ایک مسلسل مثنوی ہے، عنوانات خود کاتب کے قائم کردہ ہیں، شاعر نے قائم نہیں کیے ہیں کیوں کہ ہر موضوع کا اگلا شعر اپنے سابقہ موضوع کے آخری شعر سے مربوط ہے جسے حذف کرکے کاتب نے موضوع کو عنوان کے تحت کردیا ہے جس سے ربط و تسلسل میں خلل پڑ گیا ہے اور معنی و مفہوم کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے، بہرحال "انتخاب" کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

حمد، نعت، مدح شیخ شہاب الدین سہروردی، مدح بہاءالدین زکریا، مدح صدرالدین عارف، مدح رکن الدین ابوالفتح، در بیان سبب نظم کتاب، در بیان سخن، در بیان عشق، در بیان اسلام، در بیان کلمۂ شہادت، در بیان حج و عمرہ، در بیان توحید، در بیان دل، در بیان عقل، در بیان تصوف، در بیان مقامات، در بیان مقامات توبہ، در بیان فرقت دنیا، در بیان صبر، در بیان فقر، در مقامات سکر و صحو، در مقامات خوف و رجا، در مقامات توکل، در بیان محبت، در بیان شوق، در بیان انس، در بیان قرب، در بیان قبض و بسط، در بیان فنا و بقا، در بیان تجلی و اسما، در بیان تجرید و تفرید، در بیان جد و جود، در بیان سکر و صحو، در بیان محو و اثبات، در بیان علم الیقین و حق الیقین، در بیان

وقت، در بیان تلوین، تمکین، در بیان غیب و حضور، در بیان سمع، در بیان خاتمت رسالت، مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

باز طبعم را ہوائی دیگرست — بلبل جاں را نوائی دیگرست

اس کے بعد ''حمد'' کے اشعار ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے خالق کائنات، قادر مطلق اور ماورائے عقل ہونے کا اعتراف اور دعائیہ اشعار ہیں۔

باز طبعم را ہوائے دیگرست — بلبل جاں را نوائی دیگرست
در مشامم بوی گل دار و گزر — ایں نسیم از باغ خلد آید مگر
برترست از عرش اعلیٰ منزلش — زانکہ توحید خدا شد اولش
ہرچہ گفتم ایں ہمہ تقلید ماست — وحدت او برتر از توحید ماست
سر وحدت در نیاید فہم کس — حیرت آمد حاصل دانا و بس
ہستیش مرغ خرد را پر بسوخت — طوطئ اندیشہ ہا را لب بدوخت
صنع او چوں لطف خویش اظہار کرد — آب و گل را قابل دیدار کرد
قدرتش یک نفخہ در حکمت دمید — جوہر و جسم طبائع شد پدید
ای مبرّا از خیالات و گماں — وی منزہ از اشارات و بیاں
بارہم توفیق دہ تا ہر نفس — بر زبان نارم بجز حمد تو بس
گرچہ توحید تو می خوانیم ما — ہم تو دانائی کہ نارا نیم را
رحم کن بر غفلت نا دانیم — پس کہ خواند گر تو بیروں را نیم
ای بامید نا امیداں کوی تو — ہر دو عالم را اشارات سوی تو
مہر خود نہ تا نخوا نندم ہمہ — داغ خود نہ تا برا نندم ہمہ
بخششی کن تا بہ دار الملک دیں — گنج معنی آورم زیر نگیں
پیش ازانی کز توانائی رود — رحمتی کن گر بہ رسوائی رود
دانشم از عالم تحقیق بخش — در طریق مصطفیٰ توفیق بخش

اس کے بعد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہے کہ آپ ہی کی ذات مبارک کونین کا

مقصود ہے، دشمنوں کے جواب میں آپؐ ہی نے سب سے پہلے زبان و تلوار دونوں سے کام لیا، آپؐ کے شہر کی خاک سجدہ گاہ عالم ہے، آپؐ ہی کا نور پاک ہے جس سے آدمؑ کی آبرو قایم ہے۔

خواجۂ کونین، ختم المرسلین — صدر عالم، رحمۃ للعالمین
ذات او مقصود کونین آمدہ — مسند او قاب قوسین آمدہ
شعلہ او در بزم او افروختہ — سپہر ناموس اکبر سوختہ
قرب او ادنیٰ نمودہ قربتش — در سرای لی مع اللہ خلوتش
مشرق خورشید عزت روی او — مطلع شہ بیت دولت کوی او
در جواب خصم بکشادہ عیاں — ہم زبانِ تیغ و ہم تیغ زباں
خاک شہرش سجدہ گاہِ عالم است — نور پاکش آبروی آدم است

اس ضمن میں چند اشعار صحابہ کرام کی منقبت میں ہیں۔

چار یار او بدار ملک دیں — ہفت کشور را امیر المومنین
ہر اک از نور حقیقت بہرہ مند — در مقام محرمیت سر بلند
پیروانش رہنمای مردم اند — آسمان شرع را چوں انجم اند
جملہ غواصانِ دریای صفا — بلبلانِ باغ شرع مصطفیٰ

اس کے بعد سہروردی سلسلے کے ابتدائی تینوں مشائخ شیخ شہاب الدین سہروردی (م۔ ۶۳۲ھ)، شیخ بہاؤالدین زکریا (م۔ ۶۶۱ھ) اور شیخ صدر الدین عارف (م۔ ۶۸۸ھ) کی مدح میں اشعار ہیں، شیخ شہاب الدین سہروردی کے بارے میں کہتے ہیں۔

چرخ دیں را آنکہ قطب عالم است — الحق آں شیخ الشیوخ اعظم است
کیست آں سر دفتر مردانِ مرد — شاہباز عصر، پیر سہرورد
قدوہ ارباب تمکین و صفا — خاص حضرت آں بمعنی رہنما
بود جہل از پرتو نورش نہاں — زاں شہاب الدین خواندش جہاں
آں محمدؐ سیرت و عیسیٰ قدم — ملک دیں را چوں سلیماں محترم
کعبہ صدق و صفا آباد ازو — یثرب ثانی شدہ بغداد ازو

روضۂ او معدن انوار باد   نقد و نقش با خدا دیدار باد
چوں بصورت گشت ازیں عالم نہاں   مہدی آمد بمہد اندر جہاں

شیخ بہاءالدین زکریا کی تعریف جن الفاظ میں کرتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد کہے گئے ہیں۔

شیخ ہفت اقلیم قطب اولیا   واصل حضرت ندیم کبریا
فخر ملت بہاء شرح دیں   جان پاکش منبع صدق و یقیں
رحمت عالم دل آگاہ او   چو پیمبر استقامت راہ او
از وجود او بہ نزد دوستاں   جنت ماوئی شدہ ہندوستاں
من کہ رو از نیک و از بد تافتم   ایں سعادت از قبولش یافتم
رخت ہستی چوں بروں کرد از جہاں   کرد پرواز ہمائش ز آشیاں

ان کے بعد ان کے صاحب زادے شیخ صدرالدین عارف کی مدح ہے، اشعار اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ "کنزالرموز" کے منظوم کرتے وقت وہ باحیات تھے، لہذا تذکروں میں ۶۸۸ھ سے قبل کے جتنے سن وفات درج ہیں وہ غلط ہیں۔ (۲۸)

آں بلند آوازۂ عالم پناہ   سرور عصر، افتخار بارگاہ
صدر دین و دولت آں مقبول حق   نہ فلک بر خوان جودش یک طبق
آب حیواں قطرہ بحر دلش   چوں خضر علم لدنی حاصلش
معتبر چوں قول او افعال او   ہم بیان او گواہ حال او
مقتدای دیں قبول خاص و عام   دولتش گفتہ توئی خیر الانام

شیخ رکن الدین ابوالفتح کی مدح شروع کرنے سے قبل موضوع بدل دیا ہے کیوں کہ دوسرے بزرگوں کے ساتھ اپنے شیخ کی مدح یا مرثیہ لکھنا اور انہیں مساوی درجہ پر رکھنا آداب مریدی کے خلاف ہے، لہذا پہلے تو مذکورہ بالا مشائخ کی مدح کا جواز بیان کیا ہے، اس کے بعد اپنی طبیعت کی بلندی اور پاک بازی کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ مردان خدا ہیں، اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے اس مدح کے ہر طرح سے مستحق ہیں، لہذا ان کی مدح کو تکلیف و تکلف میں

شمار نہیں کیا جانا چاہیے، میں شاعر نہیں ہوں، یہ تو انہیں بزرگوں کا فیض ہے کہ مجھے ان کی مدح کی توفیق عطا ہوئی، میں نے سینکڑوں ہزاروں دُرِ معنی سلک نظم میں پروئے ہیں لیکن "مدح دوناں" کبھی نہیں کی، میں باغ جہاں میں سرو آزاد کے مانند ہوں، چنار کی طرح دست سوال نہیں پھیلاتا، میں وہ بلبل ہوں جس کے سر میں وصل گل کا سودا سمایا ہوا ہے، زاغ کی طرح اہل لقمہ کے لیے شور نہیں کرتا پھرتا، خاک ساری میں اگرچہ میں سارے خاکساران عالم کی خاک پا ہوں لیکن زاہدان خوش انفاس کی آبرو ہوں۔

مدح ایں مرداں نباشد شاعری   تا بہ تقلید و تکلف بنگری
بخشش اہل دل آمد رہبرم   ماشاء اللہ من نہ مرد شاعرم
از شعاع شرع دارم سروری   خاک رہ بر فرق شعر و شاعری
صد ہزاراں دُر معنی سفتہ ام   مدح دوناں بہر ناں کم گفتہ ام
سرو آزادم بہ باغ روزگار   دست پیش کس ندارم چوں چنار
لالۂ رعنا منم بی رنگ و بوی   خون دل خوردم از ایم سرخروی
بلبل ام ما وصل گل سودا کنم   نی چوں زاغ از بہر قوت آوا کنم
خاکپای خاکیان عالم ام   آبرو زاہدان خوش دم ام

اس کے بعد شیخ رکن الدین ابوالفتح کی مدح شروع کرتے ہیں اور ان کے لیے لفظ "پیر" کا استعمال کرتے ہیں جس سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ شیخ رکن الدین ابوالفتح کے مرید تھے اور انہوں نے ہی ان کی باطنی اور روحانی تربیت کی تھی۔

ساقی عشقم شراب ناب داد   قطرہ ای از بحرک نایاب داد
ہمت پیرم بجای رہ نمود   کآں ورای وہم و فہم و عقل بود
آں امیر کشور کشف و بیاں   دار ملک عشق را صاحبقراں
گلشن از باغ صدر انبیا   سید فرزانہ، ختم اولیا
کعبۂ تحقیق را از وی صفا   رکن اول از مقام او رضا
شمس ملت آسمان سروری   گوہر پاکش ز تخم حیدری (۲۹)

ہر زمانش ملک معنی در نظر   آسمانہا از زمینش پی سپر

چوں سمند ہمتش جولاں کند   ہر دو عالم را بیک میداں کند

پاکباز جانِ حیرت کوی او   آئینہ صدق و صفا در روی او

اندریں میداں بچو گان کمال   گوی بر بود از خداوندانِ حال

بادش اندر بزم حق دور مدام   جرعہ نوش او حسینی والسلام

اس کے بعد مثنوی لکھنے کا سبب بیان کرتے ہیں، اشعار بتاتے ہیں کہ جو واقعہ اس مثنوی کی تصنیف کا سبب بنا وہ ملتان میں ان کے مرشد کی خانقاہ میں پیش آیا تھا، مثنوی مکمل ہونے پر ان کے مرشد شیخ رکن الدین ابوالفتح نے نام تجویز کیا تھا، لہذا اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش نہیں رہ جاتی ہے، مثنوی ہندوستان میں لکھی گئی ہے چوں کہ مثنوی کی تصنیف کے وقت شیخ صدرالدین عارف بقید حیات تھے، لہذا ۶۸۱ھ اور ۷۱۱ھ کے درمیان لکھی گئی ہوگی، اسے ''نزہت الارواح'' پر زمانی تقدم حاصل ہے، حسینی بنیادی طور پر ایک قادرالکلام شاعر تھے، لہذا یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے روحانی تجربات کے بیان کے لیے صنف شاعری کو نثر پر ترجیح دی ہوگی، مثنوی میں سہروردی سلسلے کے مشایخ کی مدح کا التزام بھی اس قیاس کی تائید کرتا ہے کہ یہ ان کی اس سلسلے سے وابستہ ہونے کے بعد پہلی کتاب ہوگی، سبب تصنیف بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

اک شب ایں میخانہ را در می زدم   خیمہ در بزم قلندر می زدم

بر کفم از لطف ساقی جام بود   تا نہد بر پائی عقلم دام بود

من بجان از دست و پو برستیز   بانگ بر زد ہاتف دولت کہ خیز

ہر کہ در خوابست بیدارش مکن   وانکہ مستی کرد ہشیارش مکن

صبح صادق می دمد باخبر می   ہمچو دم درخویش دم گرہمد می

ہفت خلوت خانہ داری در نظر   بگذر از غوغای بازار دگر

چوں بہ ہفتم خانہ بکشادی نقاب   خیمہ نہ چرخ را بگسل طناب

شاہد معنی در آغوش خود آر   دست ازیں معشوق ہرجائی بدار

چوں تو بگذشتی دریں بالا و پست   گلبنی بینی دراں صحرا کہ ہست

زیر ہر برگ گلی چوں اختری   بیخ او بگذشت از تحت الثری

شاخ او از لا مکاں برسر زدہ   سایۂ او از عرش سر برزدہ

وصف ایں گلبنی نداند ہر زماں   نام او خود بانو گوید باغباں

عزم او کردم کہ بکشایم مگر   درہمہ عالم فرو بندم نظر

گل بہر رنگی نمود از شاخ او   ای خوش آں مرغیکہ شد گستاخ او

یک جہاں دیدم بمعنی صد ہزار   نو عروس فارغ از نقش و نگار

چوں در آمد بوی آں گل درسرم   ہمچو سوسن دہ زباں شد خاطرم

دست فکرت در سرجانی زدم   برسر ہر شاخ دستانی زدم

ہرچہ طبعم را خرد پیغام کرد   پیر ما ''کنز الرموزش'' نام کرد

ای خرد مندی کہ داری عقل و ہوش   نا توانی در رہ تحقیق کوش

اس کے بعد شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ اس کا ملکہ ہر ایک کو نہیں دیا گیا ہے تاکہ لوگ اسے کھیل نہ سمجھ لیں، اہل معنی مدتوں خونِ جگر پیتے ہیں تب اس فن پر عبور حاصل ہوتا ہے اور ایک طلسم سے سینکڑوں طلسم پیدا کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔

اہل معنی در جگر خوں خوردہ اند   ہر طلسمی را صد افسوں کردہ اند

کہ بہر مرغی رسد باری سخن   تا ببازی نشمری کارِ سخن

پردۂ اول کہ اول ساز کرد   ہم سخن بود او کہ ایں در باز کرد

ابجد آموزاں ایں دار الادب   بی سخن مشکل نمودند ایں طلب

اہل دانش چوں در صنعت زدند   برسر جاں نشتر فکرت زدند

چوں ز پیدائی خود پنہاں شدند   در تماشائی جہاں جاں شدند

اس کے بعد اس فن کی ناقدری اور اس گوہر کی کساد بازاری کا شکوہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے باز رہنے کی نصیحت کرتے ہیں، زمانہ سگ بیشہ ہے یہاں لومڑی کی سی مکاری کی ضرورت ہے، اگر تجھ میں آہو کی سی طراری نہیں ہے تو اس صحرا کی سیر کا خطرہ مول نہ لے۔

ہاں حسینی ایں ہمہ سودا چراست   برسرِ بازار ایں غوغا چراست

بشکن این گوہر کہ مقدارش نماند   دردو عالم یک خریدارش نماند
مرغ زیرک باش بشکن جام را   خاک رہ برسر فگن ایام را
این سگ بیشہ چوں روبہ پرفن است   خواب خرگوشت دہد این روشنست
چوں تنگ آہو نداری ذر نبرد   این دہاں بستہ دریں صحرا مگرد

ان کی اپنے آپ کو اس نصیحت کو کسی قصہ خواں نے سن لیا اور ان سے شیخ ابوسعید ابی الخیر کا واقعہ بیان کیا کہ مریدوں کے ساتھ ایک بار وہ کسی چکی کے پاس سے گذرے، اس کی رفتار اور سرگشتگی سے حیرت میں پڑ گئے، تنہائی میں مریدوں کو بتایا کہ چکی زبان حال سے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ محض ایک دانہ کے لیے یہ سارا جال کیوں پھیلاتا ہے، مجھے دیکھ کہ باوجود اپنے بوجھ اور سرگرانی کے جس قدر بھی سخت چیزیں مجھے دی جاتی ہیں انہیں نرم کرکے لوٹا دیتی ہوں، گران باری کے باوجود اپنے کام میں سبک روح ہوں، اگر تجھ میں بصیرت ہے تو کاملوں کی طرح خاک ساری اختیار کر، صرف اپنے کام سے مطلب رکھے گا تو سو سال کی عبادت بھی زناری یعنی خود پرستی ہوگی۔

قصہ خواں برسر حرفم رسید   گفت روزی شیخ عالم بوسعید
با مرید چند پیروں شد بدشت   از قضا بر آسیای بر گذشت
در تحیر ماند ازیں سرگشتگی   باہمہ تیزی بدیں آہستگی
با مریداں گفت روزی در نہفت   بامن این سنگ از زبانِ حال گفت
این ہمہ دام از پی یکدانہ چیست   ہمچو من باش این ہمہ افسانہ چیست
باہمہ سرگشتگی باری بہ پست   میدہم نرم آنچہ می باہم درشت
گر گرانی باشدم از بار خویش   ہم سبکروحم اندر کار خویش
ای دل مسکین گرانجانی مکن   کار جانبازاں بنادانی مکن
کم تر از کم شو اگر داری بصر   این طریق کاملانست ای پسر
گر ترا با کار خود کاری بود   طاعت صد سالہ زناری بود

اب مثنوی کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے، پہلا باب ''عشق'' سے متعلق ہے، یہاں اس

کی وضاحت ضروری ہے کہ حسینی اگرچہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں لیکن وہ اس کے خلاف نہیں ہیں، بشرطیکہ شریعت کے تابع ہو، وہ اس کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جیسا کہ عقل کے باب میں انہوں نے بیان کیا ہے، یہاں عشق کی خصوصیات بیان کرتے ہیں اور عقل سے اس کا موازنہ کرتے ہیں۔

چوں سمند فکرتم جولاں نمود   گوی معنی از دو عالم در ربود
پرتو عشق آمد این افسانہ نیست   آشنا داند کہ این بیگانہ نیست
عشق شاہا نرا چوں درمات افگند   خلوتی را در خرابات افگند
عشق دلال سر کوی فناست   شحنہ ہنگامہ جائی بلاست
شہسوار عشق چوں لشکر کشید   خواجہ را در خدمت چاکر کشید
صد عقلست این حکایت گوشدار   تا بعقل این در نہ کوئی زینہار
عقل گوید جبہ و دستار کو   عشق گوید خانۂ خمار کو
عقل میگوید پریشانی مکن   عشق می خندد کہ نادانی مکن
عقل گوید کار سازی می کنم   عشق گوید پاکبازی می کنم
عقل می گوید گدائی می کنم   عشق گوید بادشاہی می کنم

اس کے بعد کے اشعار ''اسلام'' کی تعریف میں ہیں کہ اسلام کی شرط یہ ہے کہ جو سلوک اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو، دین احمد اختیار کرنے والے کی زبان اور ہاتھ سے کوئی محفوظ نہ ہو تو وہ مسلمان نہیں ہے۔

ہاں وہاں ای گوہر کانِ خرد   دستہ ای پند از گلستانِ خرد
ہر زماں پرسی کہ شرط راہ چیست   ای برادر جاہدو فی اللہ چیست
طفل راہِ خویش را تعلیم کن   چیست اسلام ای پسر تسلیم کن
گر سخن از دین احمد می کنی   باہمہ کن آنچہ باخود می کنی
ہر کرا دست و زباں کوتاہ نیست   در مسلمانی یقیناً راہ نیست

اس کے بعد کے اشعار ''کلمۂ شہادت'' کے بارے میں ہیں کہ اپنی ہستی کے نقد کو لا

الہ میں گم کردینا چاہیے، لا و الا کی بحث میں پڑنا گمراہی ہے۔

غیر حق ہر ذرہ کاں مقصود تست — تیغ لا برکش کہ آں معبود تست
نفی و اثبات از برای گمرہیست — آنچہ کم گوئی دریں معنی بہیست
نقد ہستی گم کن در لا الہ — تا بہ بینی دار ملک پادشاہ
گرچہ گفتی الا ای دال نہ اوست — ہرچہ در فہم تو آید او نہ اوست
لا و الا را زوختر بر تراش — ایں عطام وحدت است آہستہ باش
لا چوں در وحدت رسد الا شود — آں الف بالاش ازاں پیدا شود
لا چوں الا گشت در راہِ یقیں — اول و آخر یکی گردد بہ بیں
لام لا نبودی تو آمد پیشکی — نفی خود کن تا نماند جز یکی
چوں تو خود را در جہاں برداشتی — قصر ایماں را دری افراشتی
خلوتی کن بردر. امید و بیم — بر مصلائے قناعت شو مقیم
گرچہ بردی گوی طاعت از ملک — ہمچو ہم بعجز خویش خم زن چوں فلک

اس کے بعد چند اشعار ارکان شریعت، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کی صوفیانہ رنگ میں تفسیر سے متعلق ہیں، مثلاً جب تک نفس کو فنا نہ کیا جائے نماز نہیں ہوتی، روزے کا مطلب حواسِ خمسہ کو نفسانی خواہشات سے پاک کرنا ہے، بھوک سے دل میں عاجزی اور فروتنی پیدا نہ ہو تو روزہ نہیں ہوتا، زکوۃ کی حقیقت نعمت کی شکر گزاری ہے صرف مال ہی پر نہیں ہر نعمت پر واجب ہے۔

اختیار خود بروں نہ از وجود — تا بیابی نقد اسرار سجود
چوں سر برآوری سر از سرگبرکار — سہو خود را سجدۂ سہوی بہار
تا تو باشی بستۂ ہر پیچ و تاب — روزداری صرفۂ نان است و آب
ای تہی کردہ شکم از غافلی — دل تہی کن کہ بود الصوم لی

(باقی)

اخبار علمیہ

۱۹۶۳ء میں ممالک اسلامیہ کے سفرا کی کوششوں سے بلجیم میں اسلامک کلچرل سنٹر قایم ہوا اور اس کے لیے ایک چھوٹی سی جگہ کرایہ پر لی گئی، ۱۹۶۷ء میں شاہ فیصل نے بلجیم کا دورہ کیا تو وہاں کے شاہ باڈوئن اول نے اپنا "اورینٹ ہاؤس" جو شاہی میوزیم کے طور پر استعمال ہوتا تھا، شاہ فیصل کو اس مقصد سے پیش کیا کہ وہاں مسجد اور اسلامک کلچرل سنٹر قایم کیا جائے، یہ "اورینٹ ہاؤس" بروسل کے محفوظ و پرسکون علاقے میں یورپین کامن مارکیٹ کے ہیڈ کواٹر سے چند میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، ۱۹۶۸ء میں شاہ فیصل نے اس پر خصوصی توجہ کی اور اسلامک کلچرل سنٹر کی تعمیر اور اس کے مصارف کا بار سعودی حکومت کے سپرد کردینے کا فیصلہ کیا، اسی سال بلجیم گورنمنٹ نے اپنے ملک میں مسلمانوں کے نمایندہ سنٹر کی حیثیت سے اس کو باضابطہ تسلیم کرلیا اور ۱۹۷۴ء میں اسلام کو بہ حیثیت مذہب سرکاری طور پر منظوری دی، بعد میں گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلم طلبہ کا نصاب تعلیم ایک ہونا چاہیے، ۱۹۷۸ء میں سعودیہ عربیہ کے شاہ خالد نے شاہ بلجیم کی موجودگی میں سرکاری طور پر سنٹر کا افتتاح کیا، ۱۹۸۲ء میں مکہ معظمہ کی مسلم ورلڈ لیگ نے سنٹر کا نظم اپنے ذمہ لیا اور اس کے اخراجات کے لیے ایک خاص رقم مختص کی، ۱۹۸۳ء سے اسلامک کلچرل سنٹر نے بڑی ترقی کی اس طرح ایک مدت سے اس کی سرگرمیاں جاری ہیں۔

مستقل دعائیہ تقریبات اور لکچرز کے اہتمام کے ساتھ ہی سنٹر سمینار، کانفرنس وغیرہ کا انعقاد بھی کرتا ہے اور بلجیم کے عام مسلمانوں کے معاشرتی و عائلی مسایل پر غور و فکر اور اس سلسلے کے مشکلات کے حل کی کوششیں بھی سنٹر کی قابل ذکر سرگرمیاں ہیں، سنٹر نے متعدد اسکول بھی کھولے ہیں، اتوار کا دن نومسلموں کی تعلیم اور دوشنبہ، منگل اور جمعرات کا دن عورتوں کی تعلیم کے لیے وقف رہتا ہے، مسلسل خبرنامہ کی اشاعت کے علاوہ اسلامک کلچرل سنٹر نے پبلسٹی کے لیے "اسلامک ریڈیو" کے نام سے اپنا ایک اسٹیشن اور مسلم نوجوانوں کے لیے سماجی کلب بھی قایم کیا ہے، انٹرنیٹ پر اس

کا اپنا ایک ویب سائٹ بھی ہے، مزید برآں سنٹر نادار مسلمانوں کی مالی مدد بھی کرتا ہے اور جیلوں، اسپتالوں اور اسی قسم کی دوسری جگہوں پر سنٹر کے نمایندے اس غرض سے جاتے ہیں کہ وہ ان کی پریشانیوں اور مسایل حل کرنے میں حتی المقدور مدد کریں۔ (دعوہ، انگریزی پاکستان)

کویت کی اسلامی تنظیم کے سربراہ شیخ نادر النوری نے بتایا کہ ۲۰۰۲ء میں ۲۴۵۰ یورپین مسلمان ہوئے، ان کے بیان کے مطابق گذشتہ ۲۵ برسوں میں کویت میں ساڑھے تین لاکھ ملازمت پیشہ لوگوں میں سے ۲۲ ہزار غیر ملکی افراد حلقہ بگوش اسلام ہوچکے ہیں، خاص طور سے کویت میں مقیم امریکی اور یورپی ممالک کے فوجیوں میں اسلام کے تئیں دل چسپی بڑھ رہی ہے، ایک رپورٹ کے مطابق حال ہی میں ۲۲ امریکی فوجی مسلمان ہوئے، ان کی استقامت و تربیت کے لیے اسلامی ثقافت کے موضوع پر سمینار منعقد کیے جاتے ہیں جن میں ان کو سوالات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے تاکہ ان پر اسلام کی حقانیت اچھی طرح واضح کردی جائے، اسلام کے تئیں ان کے شوق کو دیکھ کر کویت کی اسلامی جمعیت نے قرآن مجید کے انگریزی تراجم بھی ان میں تقسیم کیے ہیں، نو مسلموں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے اور اسلامی احکام و عبادات سے واقف کرانے کے لیے درس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز بن عثمان تویجری تنظیم اسلامی برائے فروغ تعلیم، سائنس و ثقافت، ایسسکو کے سربراہ ہیں، انہوں نے بوسینائی زبان میں قرآن کے ترجمہ کا افتتاح کرتے ہوئے بتایا کہ دنیا کی متعدد مشہور زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کا کام بہت تیزی سے ہورہا ہے، انہوں نے کہا کہ جائزہ برائے اشاعت قرآن کے مطابق سولہویں سے بیسویں صدی عیسوی تک قرآن کے ۵۳ ترجمے ہوئے لیکن ادھر ۲۳ سالوں میں یہ تعداد سو سے متجاوز ہوچکی ہے، انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں تو اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں۔

فرانس کے محکمۂ تعلیم کی منظوری سے بارہویں صدی عیسوی کے مشہور فلسفی ابن رشد کے نام پر ایک اسلامی درس گاہ کا قیام عمل میں آیا ہے جو شمالی فرانس کے شہر ''لیل'' کی مسجد کے امام عمار اصغر کی آٹھ سالہ کوششوں کا نتیجہ اور سرزمین فرانس کی پہلی اسلامی درس گاہ ہے۔

علم نباتات کے ماہرین کی ایک بین الاقوامی ٹیم نے حجری دور یعنی تقریباً ۱۸۰ ملین

سال پہلے کا ایک جانور ڈائنا سور دریافت کیا ہے، تیزوڈا کے ایک گاؤں اطلس ماؤنٹین میں پایا جانے والا یہ لمبی گردن اور دم والا ۳۰ فٹ دراز ڈائنا سور گینڈے سے مشابہت رکھتا ہے، مراکو کے وزیر محمد ابوطالب کے بیان کے مطابق حجری آثار و باقیات دنیا کے سب سے قدیم آثار تسلیم کیے جاتے ہیں، یہ ڈائنا سور جس گاؤں میں پایا گیا ہے اسی سے نسبت کرکے اس کا نام ''تیزوڈا سورنیمی'' رکھا گیا ہے، یہ گاؤں رباط سے جنوب مشرق میں تقریباً ۶۲۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، ابھی صرف اس کا سر، جبڑا اور کچھ ٹوٹی ہڈیوں کے جوڑ زمین سے باہر آئے ہیں، قدیم دریافتوں میں اس کے سب سے پرانی دریافت ہونے کا ماہرین کو یقین ہے۔

رومانیہ میں پائے گئے ایک جبڑے کے متعلق امریکی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ ۳۰ سے ۳۶ ہزار سال پرانا ہے یعنی جب یہ جدید انسان حجری دور میں تھا کیوں کہ جبڑے کی ساخت حجری عہد کے باقیات کی طرح ہے، واشنگٹن یونیورسٹی ان سینٹ لوئس سے وابستہ پروفیسر ایرک ٹرنکس کی سربراہی میں جب ایک ٹیم نے ریڈیو کاربن کے ذریعہ جبڑے کی جانچ کی تو معلوم ہوا کہ اس کی ہڈیاں جدید انسانوں کے حجری عہد کا پتہ دیتی ہیں، ٹرنکس نے نیشنل اکیڈمی آف سائنس کو بتایا کہ ''گرچہ ہم انہیں مکمل جدید انسان نہیں کہہ سکتے تاہم ان لوگوں کی زندگی کے باب میں غور کیا جاسکتا ہے''۔ (دی پوانیر لکھنؤ)

البانین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اینڈ سیویلائزیشن کا وجود وقت کی ضرورت اور تقاضے کے تحت ہوا تھا لیکن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کے بیان کے مطابق ۱۹۹۰ء کے بعد از سرنو اس میں ایک نئی قوت عمل اور تحریک دیکھنے میں آرہی ہے، یہ انسٹی ٹیوٹ وزارت تہذیب و ثقافت سے ملحق ہے اور اکیڈمی آف سائنس، ہسٹری انسٹی ٹیوٹ، اسٹیٹ آرکائیوز اور نیشنل لائبریری سے بھی اس کے روابط ہیں، انسٹی ٹیوٹ کے پاس ایک لائبریری اور ایک دفتر بھی ہے، یہاں سے ایک ششماہی رسالہ ''دی یونیورس'' اسلامی تہذیب و ثقافت پر ایک ماہانہ خبرنامہ اور ایک ماہوار رسالہ ''فیملی'' کے نام سے شایع ہوتا ہے، اس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کے پاس خود کا ایک اشاعتی پروگرام بھی ہے۔ (ینگ مسلم، انگریزی)

ک، ص اصلاحی

استفسار و جواب

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور ان کی قبر

محمد اطہر مسعود خاں رام پور: کیا مرزا الٰہی بخش نے غداری کر کے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرایا تھا اور کیا رنگون میں بہادر شاہ ظفر کی قبر کو ریس کورس میں تبدیل کر دیا گیا اور مزار کا نام و نشان تک مٹ گیا؟

معارف: مورخین اور بہادر شاہ ظفر کے سوانح نگاروں نے مرزا الٰہی بخش کا نام برطانوی حکومت کے وفاداروں، مخبروں اور جاہ طلبی اور وظیفہ خواری کی خاطر انگریزوں سے ساز باز کرنے والوں کی فہرست میں گنایا ہے، مقبرۂ ہمایوں میں روپوش ہونے کا مشورہ بھی مرزا الٰہی بخش ہی کا تھا، جہاں بادشاہ کی گرفتاری عمل میں آئی، اس کی تفصیل ڈاکٹر تاراچند کی کتاب (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) ص ۲۰۲ و مابعد، مطبوعہ مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۵۹ء اور بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۱۲۴ شایع کردہ کتاب منزل، لاہور وغیرہ میں موجود ہے، نیز ہڈسن کے خط سے بھی مرزا الٰہی بخش کی غداری اور حکومت برطانیہ سے اس کے ساز باز کا علم ہوتا ہے، (ملاحظہ ہو بہادر شاہ ظفر، شایع کردہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ص ۲۱۱ و مابعد و بہادر شاہ ظفر، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۶)۔

بہادر شاہ ظفر کی قبر کی مسماری کے متعلق تذکرہ نگاروں اور بعض سفرناموں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کو اینٹوں کی قبر میں دفن کر کے قبر کی اوپری سطح زمین کے برابر کر دی گئی اور تھوڑے فاصلہ پر بانسوں کا احاطہ کر دیا گیا تاکہ بانس گل سڑ کر زمین پر گر جائیں اور گھانس اگ آئے اور قبر کی کوئی علامت باقی نہ رہے (روزنامچۂ ڈیوس بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص ۱۴۹، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی) ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی موت کے بعد انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک کسی کو قبر پر جانے کی اجازت نہ تھی اور وہاں انگریزوں کا پہرہ رہا کرتا تھا اور رفتہ رفتہ قبر کا نشان بھی مٹ گیا (کتاب مذکور ص ۳۸)، لیکن اوائل اکتوبر ۱۹۰۳ء میں عبدالسلام رفیقی صاحب نے قبر کا پتا لگایا اور بادشاہ کے مقبرہ کے متعلق لکھا کہ "یہاں ٹوٹی ہوئی قبر کا نشان گھوڑوں کی ٹھوکروں سے اڑا دیا گیا کیوں کہ

اس بیری کے درخت (جس کے نیچے بادشاہ کی قبر ہے) کے ایک طرف ٹینس کھیلنے اور دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا میدان ہے" (بحوالہ سفرنامۂ برہما ص ۱۱۸ و مابعد محبوب المطابع، دہلی)۔

جولائی ۱۹۱۵ء میں مولانا سید ابوظفر ندوی نے قبر کا حال یہ لکھا ہے کہ "ایک بنگلہ کا احاطہ ہے، اس کے ایک گوشہ درخت کے نیچے ایک قبر ہے، بڑی بڑی گھانس چاروں طرف سایہ فگن ہے، ساتھ ہی زینت محل کی قبر ہے، پہلو بہ پہلو دونوں تھے، چاروں طرف قبر کے لوہے کا کٹہرہ لگا ہوا تھا کسی نے دونوں قبروں کو سرخ غلاف سے منڈھ دیا تھا، کونے میں ایک پرانے فیشن کی لالٹین لٹکا دی تھی" (سفرنامہ برہما، ص ۱۱۷) "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" کے مصنف نے لکھا ہے کہ "اس مقام پر انگریزی زبان میں ایک کتبہ عبدالسلام رفیقی صاحب کی کوشش سے نصب کیا گیا جس پر بادشاہ کی تاریخ وفات کے ساتھ ساتھ بیگم زینت محل کی تاریخ وفات بھی کندہ کرائی گئی ہے، انہوں نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ دونوں قبر کو ملا کر ایک تعویذ بنا دیا گیا ہے اور لوہے کا کٹہرہ اور ٹین کا سائبان ہے اور بہادر شاہ ظفر کے پوتے سکندر بخت قبر کی مجاوری کرتے ہیں" (ص ۱۳۵)، اس وقت رنگون میں بہادر شاہ ظفر کا مقبرہ زیارت گاہ خلائق ہے۔ ک، ص اصلاحی

بزم تیموریہ (مکمل سیٹ)

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد اول: اس میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں میں سے بابر، ہمایوں اور اکبر کی علم دوستی، علما نوازی اور ان کے درباری شعرا و فضلا اور دوسرے اصحاب کمال کا تذکرہ ہے۔ قیمت ۱۵۰/روپے

جلد دوم: اس میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں میں سے جہانگیر اور شاہ جہاں کی علم دوستی، علما نوازی اور ان کے درباری شعرا و فضلا اور دوسرے اصحاب کمال کا تذکرہ ہے۔ قیمت ۵۰ روپے

جلد سوم: اس میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب اور اس کے بعد کے بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی و ادبی ذوق، ان کی علم دوستی و علم پروری و علما نوازی اور ان کے دربار کے شعرا و فضلا اور دوسرے ارباب کمال کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ ظفر کی اخلاقی و صوفیانہ شاعری کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ قیمت ۵۶/روپے

وفیات

آہ جناب خالد مسعود!!

یہ خبر علمی و دینی خصوصاً ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے قدردانوں اور ان کے علوم و افکار کے شیدائیوں کے لیے بڑی غم ناک اور روح فرسا ہے کہ یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء کو رسالہ تدبر لاہور کے مدیر جناب خالد مسعود صاحب کا انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد رشید اور علمی وارث و جانشین تھے، انہوں نے اپنی زندگی فکر فراہی کی شرح و ترجمانی اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کردی تھی، ان کی وفات سے ہم قرآن و حدیث کے ایک بڑے خدمت گزار سے محروم ہوگئے۔

مرحوم کو جگر کی بیماری تھی، خون کی رگ بار بار پھٹ جاتی تھی اور خون کی قے ہونے لگتی تھی، آخر اس بیماری نے ان کا کام تمام کردیا۔

خالد مسعود صاحب ضلع جہلم کے ایک گاؤں "للہ" میں ۱۶/دسمبر ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۱ء میں نوشہرہ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک اور ۱۹۵۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں بی-ایس-سی کیا، ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم-ایس-سی کیا، ۱۹۵۸ء میں انڈسٹریل ریسرچ لیبارٹریز سے وابستہ ہوئے پھر مزید تعلیم کے لیے لندن گئے اور ۱۹۶۵ء میں وہاں کے کنگز کالج سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا، واپسی کے بعد ۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں ایم-اے کیا، ۱۹۸۵ء میں قاید اعظم لائبریری میں ملازمت کی، اس سے وابستگی کے زمانے میں بچوں کے لیے آسان زبان میں متعدد مفید اور معلوماتی کتابیں تحریر کیں، جو بہت مقبول ہوئیں اور بعض پر ان کو ایوارڈ بھی ملا، گو ان کتابوں میں فلکی طبیعیات کی جدید ترین تحقیقات کے نتائج اور کائنات کے بارے میں نئے افکار و نظریات پیش کیے گئے ہیں، تاہم اسلامی نقطۂ نظر کو او جھل نہیں ہونے دیا ہے۔

وظیفہ یاب ہونے کے بعد انہوں نے متعدد انگریزی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا جن کو مقتدرہ قومی زبان اور اردو سائنس بورڈ وغیرہ نے شایع کیا۔

خالد مسعود صاحب نے گو جدید تعلیم حاصل کی تھی تاہم ان کو شروع ہی سے دین و مذہب سے شغف تھا اور دین دار گھرانے سے ان کا تعلق تھا، ان کی طبیعت میں سلامت روی کے ساتھ تلاش و تحقیق کا داعیہ تھا، اس لیے وہ روایتی اور خاندانی مسلمان بن کر نہیں رہنا چاہتے تھے بلکہ عربی زبان کی تحصیل کرکے براہ راست دین کو اس کے اصل ماخذ سے سمجھنا چاہتے تھے اور علی وجہ البصیرت مسلمان رہنا چاہتے تھے، فضل ربانی اور توفیق الٰہی نے یاوری کی اور ۱۹۵۸ء میں خوش قسمتی سے ان کی ملاقات دور حاضر کے سب سے بڑے قرآنیات کے عالم مولانا امین احسن اصلاحی سے ہوئی تو گویا گوہر مراد ان کے ہاتھ آگیا اور پھر مولانا کو چھوڑ کر انہوں نے کسی اور طرف نگاہ نہیں اٹھائی کہ ع کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　و ندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

مولانا نے بھی ان کو ہونہار سمجھ کر اور ان کا ذوق و شوق دیکھ کر انہیں اپنے آغوش شفقت میں لے لیا، پہلے عربی زبان کی تعلیم دی جب اس کی استعداد پختہ ہوگئی تو مسلم شریف پڑھائی اور قرآن مجید کو سبقاً سبقاً پڑھایا، اس کے بعد وہ اپنے استاد کے علمی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے اور حوالے و مراجع کی تلاش میں بھی استاد گرامی کی مدد کرنے لگے، اس طرح مولانا کی تربیت نے ہیرے کو چمکا دیا اور خالد مسعود صاحب میں عربیت اور قرآن فہمی کا عمدہ ذوق پیدا ہوگیا۔

مولانا نے جب نوجوان طلبہ پر مشتمل حلقۂ تدبر قرآن قایم کیا تو اس میں یہ بہت پیش پیش رہے، گو یہ حلقہ قایم نہیں رہ سکا مگر اس کے قیام پر اس وقت کے مشہور فضلا مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ نے ان کو داد دی تھی۔

جناب خالد مسعود کا جوش و حوصلہ، محنت و ریاضت اور اخلاص و طلب صادق دیکھ کر مولانا امین احسن صاحب نے ان کی رہنمائی میں بخل سے کام نہیں لیا، ان کے پاس جو کچھ تھا سب اس جوہر قابل کے حوالے کردیا اور مولانا حمید الدین فراہی سے قرآن مجید میں فکر و تدبر کے جو طریقے سیکھے تھے انہیں ان کو بھی سکھایا اور علم و معرفت اور حکمت کا جو خزانہ انہیں بارگاہ حمید سے

ملا تھا اسے اور مولانا فراہیؒ کے مسودات بھی ان کے سپرد کردیے، چنانچہ جب مولانا نے میثاق نکالا اسی زمانے سے اس کا مستقل باب افادات فراہی خالد مسعود صاحب کے ذمہ ہوگیا تھا، جس میں وہ برابر مولانا کے افکار و خیالات کی ترجمانی کررہے تھے۔

۱۹۸۰ء میں حلقۂ تدبر قرآن کو ادارۂ تدبر قرآن و حدیث کا نام دیا گیا اور اس کے زیر اہتمام رسالہ تدبر جاری کیا گیا تو چند شماروں کے بعد اس کی ادارت کی ساری ذمہ داری ان ہی کے سپرد کردی گئی، مولانا امین احسن صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے درس قرآن دینے سے معذور ہوگئے تو اس میں بھی ان کی قایم مقامی کا شرف ان ہی کو حاصل ہوا، غرض فکر فراہی ان کے دل و دماغ میں پوری طرح رچ بس گیا تھا، ۱۹۹۹ء میں مولانا اصلاحی پر سرائے میر میں جو سمینار ہوا، اس میں ان کے آجانے سے اس کا وزن و وقار بہت بڑھ گیا تھا۔

خالد مسعود صاحب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کے بعض غیر مرتب اور نامکمل کاموں کو مرتب و مکمل کیا اور ان میں حسب ضرورت اور وقت کے اقتضا کے مطابق توسیع و اضافہ بھی کیا اور مولانا اصلاحی کے بعض امالی کو بھی ترتیب و تہذیب کے بعد شایع کیا، اس سلسلے میں تدبر حدیث کے نام سے مؤطا و بخاری کے شروح کئی جلدوں میں شایع کیں، ان کی تفسیر کی تلخیص اور ترجمے کو تفسیر سے الگ کرکے ترجمہ قرآن کے نام سے شایع کیا، اس کے ساتھ خود اپنے تصنیفی کام بھی برابر انجام دیتے رہے، انتقال سے چند مہینے پہلے سیرت پر ان کی عظیم الشان کتاب ''حیات رسول امی'' شایع ہوئی تھی، اس کے بعض حصے میں نے رسالہ تدبر میں جب پڑھے تو مجھے اس میں ان کا انفرادی رنگ صاف نظر آیا اور ۱۹۹۹ء میں جب ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا یہ تاثر ان سے بیان کیا غالباً اسی لیے کتاب چھپتے ہی انہوں نے میرے پاس بھیجی، میں اس پر تبصرے کے لیے فرصت و اطمینان کا منتظر تھا، مجھے کیا پتا کہ وہ اتنی جلدی رخت سفر باندھ لیں گے۔

خالد مسعود صاحب کا علم و مطالعہ وسیع تھا، ان کو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر عبور تھا جس سے انہوں نے اپنے مضامین اور کتابوں میں خاطر خواہ فایدہ اٹھایا۔

ان کا جو حلیہ اور سراپا میرے ذہن میں تھا میں نے ان کو اس کے بالکل برعکس پایا، ان کا

چہرہ بڑا نورانی اور وہ خالص دینی وضع قطع کے شخص تھے، اپنے علم و فضل کی طرح تقوی و طہارت میں بھی ممتاز اور عابد و زاہد اور شب بیدار تھے، بڑے خوش مزاج و خوش اخلاق تھے، غرور و نخوت کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، اہل علم اور علمائے حق کی طرح ان کی طبیعت میں بڑا انکسار، تواضع اور فروتنی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

وہ اس مشن کے علم بردار تھے جس کے علم برداران کے استاد مولانا امین احسن صاحب تھے، مولانا اصلاحی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کے فکر سے اہل علم کو متعارف کرایا، ان کے بعد یہی کام ان کے لایق شاگرد جناب خالد مسعود انجام دے رہے تھے، اب ان کے رفقا خصوصاً جناب جاوید غامدی وغیرہ پر یہ بڑی ذمہ داری آگئی ہے، دعا ہے کہ یہ تمام حضرات مولانا فراہی و اصلاحی اور جناب خالد مسعود کے نور بصیرت کو عام کرتے رہیں تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے۔ (ض)

آثار علمیہ وادبیہ

مکتوب مولانا سید سلیمان ندویؒ

''مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک ہم وطن نے جو مدرسہ حنفیہ آرہ میں مدرس تھے، عربی میں ترجمہ کرکے ان کو دو مقالے بغرض اصلاح بھیجے تھے اور اس کے ساتھ ہی عربی میں ایک خط بھی لکھا تھا، مضامین تو ہمارے پیش نظر نہیں لیکن عربی خط جیسا کچھ ہے، اس کا اندازہ ہر عربی داں کرسکتا ہے لیکن سید صاحب نے ان کو جو مشورہ دیا وہ بڑا صائب اور مخلصانہ و مشفقانہ ہے، یہ دونوں خطوط ڈاکٹر سید حسنات دسنوی نے ہم کو بھیجے ہیں، انہیں ان کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے، پہلے مولوی صاحب کا عربی خط اور پھر مولانا سید سلیمان ندوی کا جوابی خط ملاحظہ ہو'' (ض)

الی السید سلیمان الندوی

صاحب الفضل الجسیم والجود العمیم ادام اللہ علینا برکاتک -

عقب تحیة وسلام فانا ابعث الیک مقالتین مترجمتین الی العربیة وهما من المشاغل العلمیة التی تبدو من العدم الی الوجود وقتا بعد وقت فاحب ان توقع بصرك علیهما وتطالعهما بعین الاصلاح واذا وجدت فیهما خطئا فاجعل علیه خطا واکتب عوضا عندما ناسب المقام واذا فعلت ذلک فاشکرك شکرا جمیلا -

قد حان وقت انفساخ المدرسة لقدوم شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن فارجو ان تردهما الی وطنی دسنة فاقضی رمضان فی الاهل والوطن والسلام

الکاتب

السید محمد عبداللہ الدسنوی

المدرس فی المدرسة الحنفیه آره

یوم الخمیس - ۲۲/ شعبان سنة ۱۳۵۹ھ

دفتر دارالمصنفین، اعظم گڈھ

عزیزم سلمہ اللہ تعالی

السلام علیکم - ایک زمانہ سے آپ کی ایک امانت میرے پاس پڑی ہے، آج اس کو واپس بھیجتا ہوں۔

بہتر یہ ہے کہ کسی ادبی کتاب مثلاً مقدمہ ابن خلدون کا اردو ترجمہ کرلیجیے، پھر اپنی طرف سے عربی بنایئے، اس کے بعد اپنی عربی عبارت اصل پر پیش کرکے ملایئے اور اس کے طریقِ تعبیر کو سمجھیے اور یاد رکھیے، یہ بے استاد کے عربی سیکھنے کی مفید ترکیب ہے۔

والسلام

سید سلیمان

۲۹/ رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ

ادبیات

کتنی پُرکیف ہے عالم کی فضا عید کے دن

از جناب وارث ریاضی صاحب☆

ہر سو چھائی ہے مسرت کی گھٹا عید کے دن | اے خوشا صَلِّ علیٰ ، فضلِ خدا عید کے دن
رب کی جانب سے ہے جنت کی بشارت ان کو | روزہ داروں کو ملا خوب صِلا عید کے دن
ساری دنیا کے مسلماں ہیں مسرت بہ کنار | کتنی پُرکیف ہے عالم کی فضا عید کے دن
عید آئی ہے مساوات کا پیغام لیے | عام ہے دعوتِ اخلاص و وفا عید کے دن
اب نہیں دوریِ منزل کی شکایت مجھ کو | بچھڑے احباب و اعزا سے ملا عید کے دن
دھل گئی دل سے مرے، گردِ کدورت ساری | دشمنِ جاں سے بھی شکوا نہ رہا عید کے دن
عمدہ کپڑوں میں امیروں کے ہیں بچے شاداں | خوش نصیبی پہ ہیں وہ نغمہ سرا عید کے دن
اُف، وہ بچے جو ہیں آغوشِ پدر سے محروم | اُن کے جسموں پہ ہے عسرت کی ردا عید کے دن
گھر میں اک وقت کا کھانا بھی نہیں ہے موجود | جیب میں ایک بھی پیسا نہ رہا عید کے دن
ان کا غم خوار و مددگار نہیں ہے کوئی | تنگ ہے ان کے لیے ارضِ خدا عید کے دن
ماں ہے مغموم و پریشاں تو ہیں بچے گریاں | ہوگیا زخمِ یتیمی جو ہرا عید کے دن
میری آنکھوں سے امنڈنے لگے غم کے آنسو | ان کو روتے ہوئے دیکھا نہ گیا عید کے دن
موسمِ گل میں وہ محرومِ بہاراں، صد حیف! | جن سے کترا کے گزرتی ہے صبا عید کے دن
ہیں وہ مغموم بہت، غم سے پگھل جائیں گے | آسماں! ان پہ ستم اور نہ ڈھا عید کے دن
یاد پھر آگئی گجرات کے مظلوموں کی | درد کچھ دل میں سوا ہونے لگا عید کے دن
کوئی معصوم کہیں محوِ فغاں ہے وارث | پایۂ عرشِ خدا ہلنے لگا عید کے دن

☆ کاشانۂ ادب، ہنکا (دیوراج) ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار 845453۔

مطبوعات جدیدہ

• **مقالات نذیر:** از جناب پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۹۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی نمبر-۲۔

ہندوستان کے چند اہم اور اب تک غیر معلوم کتبات، فارسی فرہنگ نویسی، نو دریافت مخطوطات، غالب و محمود شیرانی اور ایاز محمود کے علاوہ اس مجموعۂ مقالات میں متون کی تصحیح و تنقید میں تخریج و تعلیقات کی اہمیت جیسے بیش قیمت و بلند پایہ مضامین شامل ہیں، فارسی زبان و ادب پر غیر معمولی دست رس اور بلند ترین معیار تحقیق کتاب کے فاضل جلیل مصنف کی شناخت ہے لیکن اس مجموعہ میں پروفیسر شیرانی اور دستنبو و ساتیر جیسے مضامین میں ان کی تنقیدی شان بھی عروج پر ہے، پہلا مضمون کھنبایت کے چند قدیم کتبات سے متعلق ہے جس سے دنیائے علم کو خبر ہوئی کہ کھنبایت میں یہ فارسی کا قدیم ترین کتبہ ہندوستان کے منظوم کتبوں میں سب سے قدیم ہے، غزل کی ہیئت میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی پر معرفت غزل بھی شاید پہلی بار کسی کتبے کی وجہ سے محفوظ رہی، فاضل محقق نے یہ بھی واضح کیا کہ صاحب غزل سعدی شیرازی کا معاصر ہے اس لیے عارفانہ رنگ تغزل کی وجہ سے اس کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے، کتاب میں یہ غزل دو الگ الگ مضامین میں شامل ہے، اسی طرح زکی الدین گارونی کے لوح مزار کے کتبے کی بحث میں اس دور کی تاریخ کے متعلق متعدد اہم گوشے روشن کیے گئے اور وثوق سے اس حقیقت کا اظہار کیا گیا کہ کتبات کی کثرت و تنوع نے ہندوستانی فارسی ادب کو ایران سے زیادہ غنی و ممتاز کردیا ہے، مطالعات فرہنگ میں فرہنگ شیر خانی، فرہنگ قواس، فرہنگ زفان گویا پر مقالات میں مطالعہ و تحقیق کا ایک جہان آباد ہے، لفظ رواں کے تلفظ و معنی کی بحث میں رواں کو زبر اور پیش دونوں کے ساتھ درست قرار دیا ہے لیکن ترجیح رواں بالفتح کو دی گئی ہے اور یہ بھی کہ روحِ رواں کی موجودہ صورت کی جگہ روح و رواں زیادہ درست ہے، یہ پوری بحث لسانیات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بڑی دل چسپ ہے، غالب و شیرانی، فاضل مصنف کے محبوب موضوع ہیں لیکن

تنقید کی راہ میں یہ محبت مانع نہیں، البتہ شیرانی کے باب میں عقیدت کی سرشاری ان کے قلم کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی ہے، شعر العجم کے حوالے سے شبلی و شیرانی کی آویزش میں ان کا رویہ احتیاط کا ہے کہ تنقید شعر العجم کا مقصد علامہ شبلی کی علمی فضیلت کی منقصت (؟) نہ تھی بلکہ یہ اس روش کے خلاف احتجاج تھی جس میں تحقیق پر تنقید اور عقل کی جگہ نقل کو ترجیح دی جاتی تھی، ان مقالات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان سے فارسی زبان و ادب خصوصاً اس کے ہندوستانی متعلقات کے بارے میں جویان تحقیق کے لیے نئی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں، غالب کے مطالعے میں اس افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ غالب کے خلاق ذہن کا کلام ایک انسائیکلو پیڈیائی ترتیب کا متقاضی ہے لیکن اس کے لیے حوصلہ مند اہل قلم نظر نہیں آتے، یہ احساس بھی ہے کہ دساتیر اور دور اسلامی کی فارسی سے اب واقفیت ختم ہوتی جاتی ہے جس کی وجہ سے غالب کے فارسی کلام کا تنقیدی اور لسانی مطالعہ گویا ناممکن سا ہو گیا ہے، اس بلند پایہ کتاب اور صاحب کتاب کے متعلق وہی جملہ شاید زیادہ مناسب ہے جو خود ان کے ممدوح شیرانی کے متعلق رقم ہوا ہے کہ وہ ہر طرح کی ستائش سے مستغنی ہے البتہ اردو عبارت میں بعض الفاظ جیسے مغلوط، جسور، بقراء واقعی اور مختتم گفتگو اپنی غرابت کا احساس دلاتے ہیں۔

بطواف کعبہ رفتم: از جناب پروفیسر شعیب اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع دلآویز گرد پوش، صفحات ۱۵۷، قیمت: ۷۵ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲۔

زیارت حرمین شریفین کی روداد اور سفر نامے اردو ادب کا نمایاں حصہ ہیں، وادی شوق میں محبت، عقیدت، جوش اور جذبے کی فراوانی جس درجہ اس راہ کے مسافر کے نصیب میں آتی ہے شاید کسی اور سفر کا یہ مقدر نہیں، یہ کہنا درست ہے کہ حج ایک ایسا تجربہ ہے جو الفاظ کی بندش سے ماوراء ہے، صرف احساس ہے کہ جتنا محسوس کیا جاتا ہے سرشاری و بیخودی کا عالم اسی درجے بیکراں ہوتا جاتا ہے، احساس کی یہ دولت قرطاس و قلم کو ودیعت ہوتی ہے تو یہ محسوسات کسی ثروت و دولت سے کم نہیں ہوتے، زیر نظر سفر نامہ حج بھی اسی زمرے میں آتا ہے جس میں سفر کے اسباب و مراحل کو سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہیں خانہ کعبہ اور روضہ مطہرہ کی دید کے وقت دل و دماغ کی کیفیتوں کو بڑی صداقت سے کاغذ پر اتارنے کی کوشش کی گئی ہے، روضہ اقدس ﷺ کے

نزدیک اس احساس کی سچائی کا کون منکر ہو سکتا ہے کہ "وہم و گمان کو بھی اس جہان رنگ و بو، تقدیس اور احترام کے اس محوطہ میں پرواز کی طاقت نہیں تھی...... اندر سے دل بے قرار کہ یہاں کے جاروب کش بن جائیں، غبار بن جائیں اور دیوار و در کو آنکھوں کا سرمہ بنالیں" جذبات کی ایسی خوبصورت، دلکش اور خالص عکاسی اس سفر نامے میں قدم قدم پر موجود ہے، گرچہ سفر کی بعض صعوبتوں اور مشکلوں کا بھی ذکر ہے جن کے ذمہ دار معلم حضرات زیادہ ہیں لیکن سفر شوق کی آبلہ پائی میں اس شکوے کی کیا اہمیت، فاضل مصنف، فارسی زبان کے نمایاں استاد اور ادا شناس ہیں، شعری ذوق بڑا پاکیزہ ہے، اس سفر نامے میں اس خوبی کا اظہار فارسی اور اردو اشعار کے بر موقع انتخاب و استناد سے اس طرح ہوتا ہے کہ خود شعر و شاعر اس تذکرے کی یہ دولت رفعت و شوکت کی بلندیاں طے کرتے نظر آتے ہیں، یہ سفر نامہ ہر صاحب ذوق کی نظر سے گزرنے کے لائق ہے خصوصاً مسافران حج کے لیے یہ بہترین توشہ راہ ہے، کہیں کہیں بعض الفاظ کے استعمال میں فارسی کا غلبہ نظر آتا ہے، مثلاً ٹھیک کی جگہ درست چالیس سال بعد، ساتویں صدی ہجری کے عراقی ہمدانی کے سال وفات (م ۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء) کا سہو کتابت واضح ہے، کتنی صدیوں کی جگہ کس صدیوں کی تشنگی اور حفیظ میرٹھی کو حفیظ پوری لکھنا بھی اسی سہو کا نتیجہ ہے، داڑھی اور عصا کے متعلق یہ لکھنا کہ "سنا تھا دونوں چیزیں جز و سنت تھیں" احتیاط کے خلاف ہے۔

نقوش عقاد: از ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۸۰ روپے، پتہ: شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

عباس محمود العقاد، مصر کے مشہور اہل علم و قلم اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، ان کے سلسلۂ عبقریات نے خاص طور پر ان کو شہرت عطا کی، اردو داں طبقہ بھی ان کی کتابوں سے ناآشنا نہیں، زیر نظر کتاب میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے لائق استاد نے ان کی شخصیت اور علمی و عملی زندگی کا ایک جامع مرقع پیش کر کے چار ابواب میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت بلال اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق عقاد کی تحریروں کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، مقصد یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے سلسلے میں اول الذکر دونوں حضرات اور پھر نسلی امتیاز اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں مستشرقین اور بعض کج فہم مسلمان مصنفین کی دیدہ و دانستہ

بے راہ روی بلکہ تلبیسات کا رد اور ازالہ کیا جا سکے، لائق مترجم نے سادہ اور آسان زبان میں ان خیالات کو اردو میں منتقل کر دیا ہے، عقاد کے سوانح بھی پراز معلومات ہیں، ان کی تاریخ پیدایش کے متعلق لکھا کہ وہ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے لیکن آفس ریکارڈ کے مطابق ان کا سن پیدایش ۱۸۹۸ء ہے، اس قدر واضح فرق کی توجیہ ضروری تھی لیکن اس سے اعتنا نہیں کیا گیا، عقاد کی شاعری کے متعلق لکھا کہ "ان کی شاعری فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے" اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ذکر میں یہ جملے بھی ہیں کہ "آپ سے مروی احادیث کم کلمات پر مشتمل ہیں، اس سے آپ کی لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے" اور یہ کہ "آپ کی باتوں میں بلاغت، تخلیقی اپج اور حکمت و دانائی کے معائر (؟) موجود ہیں" "حضرت عمرو بن العاصؓ کے مشہور واقعہ تحکیم میں لفظ "غداری" بھی مناسب نہیں۔

شہر بقا: از جناب مظفر مجاز، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکیڈمی، مدینہ مینشن نارائن گوڑہ، حیدرآباد-۱، اور مکتبہ جامعہ ممبئی وغیرہ۔

مثنوی کی ہیئت اور بیانیہ اسلوب میں زیر نظر شعری کاوش، اردو کے موجودہ شعری ذخیرے میں جدت، افادیت اور وقعت کا احساس دلاتی ہے، اس کا موضوع ہندوستان بلکہ ایک عالم کے آشوب اور نئی کربلاؤں کی ابتلاؤں کی منظرکشی ہے، یہ ایک ایسا عصری منظرنامہ ہے جس میں موجودہ دور کے انسانی کرب اور انسانیت کے المیے کا نوحہ، جذبات اور فن کی بلندیوں سے ہم آہنگ ہے، جناب مظفر مجاز ایک عرصے سے حیدرآباد دکن میں لباس مجاز میں مستور رہنے کے بعد اب قبول و اعتراف کی حقیقت میں ظاہر ہوئے ہیں، علامہ اقبال سے ان کا تاثر بلکہ شیفتگی ان کے کلام سے ظاہر ہے، پس چہ باید کرد، ارمغان حجاز، پیام مشرق اور جاوید نامے کے منظوم ترجموں نے ان کی اس شہرت میں اور اضافہ کیا، زیر نظر شہر بقا کو جدید جاوید نامہ سے تعبیر کرنا شاید بے جا نہ ہو جس میں شاعر عالم اسفل سے عالم افلاک بلکہ مقام اعلیٰ علیین کی سیر میں محو پرواز ہے، اس سیر کے منازل میں سات طبق اور سات برج ہیں، تخلیق و ہبوط آدم، کرہ ارض اور اس پر برپا معرکہ خیر و شر کی یہ داستان اس وقت دل چسپ موڑ پر آتی ہے جب ساتویں طبق پر غالب اور پھر ان کی رہنمائی میں حافظ و رومی و عرفی و سعدی و اقبال سے شاعر کی ملاقات ہوتی ہے، ٹیپو و سراج اور حسینی و خمینی

بھی ان برجوں میں موجود ہیں، شاعر ان کو موجودہ آشوب زمان و مکان سے باخبر کرتا ہے، شکوہ و جواب شکوہ کا یہ انداز بس پڑھنے کے لائق ہے، اس میں سیاست و ادب کی آلایشوں پر جا بجا تیکھے طنز بھی ہیں، آخر میں اس کا اختتام نوائے شہیداں کے عنوان سے ہوا ہے ؎

منزل سے واسطہ ہے نے مطلب مقام سے　　جاری ہے ایک لا متناہی سفر یہاں

اور سب سے آخری شعر پر سفر اس طرح ختم ہوتا ہے کہ ؎

تو پھر تو شہنشاہ اقلیم کل　　نگہباں ہوں تیرے ختم الرسلؐ

اس وقیع اور بامقصد شعری کاوش کے لیے شاعر اور ناشر دونوں مستحق تبریک و تحسین ہیں۔

سعید کامٹوی، عہد، شخصیت اور فن: از ڈاکٹر عبدالحمید پٹیل، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، مجلد، صفحات ۲۵۶، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر ارشد جمال، ٹیچرس کالونی، اریکھیرا، کامٹی ۴۴۱۰۰۲، اور صالحہ بک ٹریڈرس، مومن پورہ، ناگپور۔

مہاراشٹر کا علاقہ ناگ پور اور کامٹی اس لحاظ سے واقعی بہت اہم ہے کہ اردو زبان کی ادبی تاریخ کا بڑا حصہ اس سے منسوب بھی ہے اور مستور بھی، اس سے پہلے جناب شرف الدین ساحل ناگپوری نے اس کے تعارف و اعتراف کی ابتدا کی، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں انیسویں صدی کے اواخر کی ایک اہم شخصیت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جناب سعید کامٹوی مرحوم پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے، فروغ جاوید ان کے نعتیہ اور ارمغان جدید ان کے غزلیہ کلام کا مجموعہ ہے، بعد میں ان کے کلام کا ایک انتخاب پاکستان سے بھی شایع ہوا، زیر نظر کتاب میں ان کی شخصیت، سماجی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا مفصل جائزہ لیا گیا، ان کی شخصیت کا فیضان بھی خاصا رہا، ان کے تلامذہ کی ایک خاصی تعداد کا بھی اس میں ذکر ہے جن کے اثر سے کامٹی اور اس کے اطراف کا ماحول اب تک علم و ادب سے ہم کنار ہے، لائق مصنف نے ایک باب میں ان کی غزل گوئی پر سیر حاصل بحث کی ہے اور آخر میں وسط ہند کے ادبی ماحول میں ان کے مرتبے کا تعین کیا ہے کہ انہوں نے اس علاقے میں دبستان لکھنؤ کے رنگ کو فروغ دیا اور نعت گوئی میں تو وہ گویا پہلے شاعر ہیں جن سے اس علاقے میں اس مبارک صنف ادب کا آغاز ہوا، کتاب میں سعید مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب بھی ہے، اس طرح یہ کتاب سعید اور بھی مفید ہوگئی ہے۔ ع-ص

۲۰۰۳ء

خدایانِ سخن و پیمبرانِ فن

میر ببر علی انیسؔ اور **مرزا سلامت علی دبیرؔ**

(۱۸۰۳ء تا ۱۸۷۴ء) (۱۸۰۳ء تا ۱۸۷۵ء)

کا سال ہے

ضرورت ہے کہ ہم اپنے ان عظیم فنکاروں کے لسانی، ادبی، شعری اور فنی عطیات کی حقیقی قدردانی کا ثبوت دیں اور اپنی جانب سے ''عرفان جمیل'' کا قرار واقعی حق ادا کریں۔

ان عظیم شاعروں نے صرف زبان و ادب ہی کی بڑی بڑی خدمتیں انجام نہیں دیں بلکہ انتہائی عظیم الشان انسانی، اخلاقی اور تہذیبی خدمتیں بھی انجام دی ہیں، ان کی عظیم شعری روایت...... ایمانی استحکام کے ساتھ ساتھ روحانیت، روشن فکری، رواداری اولوالعزمی اور عام انسانی ہمدردی کے اقدار کی حامل اور انہیں پروان چڑھانے والی ادبی و شعری روایت ہے! جس کی بطور خاص آج دنیا کو ضرورت ہے!!

کرو معاصر و طرز انیسؔ میں بھی سخن
دبیرؔ مملکتِ فکر و فن کو یاد رکھو
جنہیں نے ہوئے لہجہ وہ اک زمانہ ہوا
کہ جس کا حسنِ سخن فاتح زمانہ ہوا

انجمن اعتدال پسند مصنفین

دہلی ☆ لندن ☆ نیویارک ☆ تہران ☆ سڈنی

☆☆

جاری کردہ

مرکزی دفتر برائے انجمن S9/21، سفینہ روڈ، جوگابائی ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25